Phon[redacted]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1962ء

دوسری شادی

عن المسور بن مخرمة قال سمعت رسول الله صلعم يقول و هو على المنبر ان بنی هشام بن المغیرة استاذنوا فی ان ینکحوا ابنتهم علی بن ابی طالب فلا اذن ، ثم لا اذن ثم لا اذن ، الا ان یرید ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی و ینکح ابنتهم ، فانما هی بضعة منی یریبنی ما ارابها ویوذینی ما اذاها ۔ هکذا قال ۔
(بخاری ۔ کتاب النکاح)

حضرت مسور بن مخرمہ سے روایت ہے ۔ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے یہ اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی حضرت علیؓ سے کریں، تو آپؐ نے فرمایا کہ "میں ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہیں دونگا ۔ سوائے اس کے کہ ابن ابی طالب ، یعنی حضرت علیؓ میری بیٹی کو طلاق دیدیں اور ان کی بیٹی سے نکاح کرلیں ۔ (حضرت) فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے ۔ مجھے بھی وہ چیز قلق پہنچاتی ہے جو اس کو قلق پہنچاتی ہے اور جس بات سے اسے ایذا پہنچے اس سے مجھے بھی ایذا پہنچتی ہے" ۔ اس طرح آپؐ نے فرمایا ۔

اس سے ظاہر ہے کہ پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر دوسری شادی نہیں کی جا سکتی ۔ اور ہر شخص جب جی چاہے دوسری شادی نہیں کرسکتا ۔ اسکے لئے اجازت لینی پڑتی ہے ۔

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

لاہور

بدلِ اشتراک
ہندو پاکستان سے سالانہ - آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ - ۱۶ شلنگ

قیمتِ فی پرچہ
ہندو پاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر (۷۵۰۰)
خط و کتابت کا پتہ :-
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گل برگ۔ لاہور

جلد ۱۵ | ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء | نمبر ۹

فہرستِ مضامین

لمعات ——— ۲
یتیم پوتے کی وراثت ——— ۹
حقائق و عبر (اب اعتراض کیوں؟ - صحابہؓ کی شان میں) ——— ۲۵
باب المراسلات ——— ۳۰
(کمیونزم اور اسلام - تواتر - قرآنی نصب العین - ملحد و کافر کی جان بچانا)
شرک ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۴۱
ترکِ دنیا ——— ۵۰
نقد و نظر (شعر العرب - فردوسِ گم گشتہ - مسلمانوں کے فرقے) ——— ۵۳
احتساب ——— ۵۷
اسلام اور علومِ حاضرہ ——— (نواب محسن الملک مرحوم) ——— ۷۱
رابطہ باہمی ——— ۷۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعاتؔ

ایک مہذب ملک، اور آئین و قوانین کا احترام کرنے والا معاشرہ، انسانیت کے لئے اس لئے آیۂ رحمت ہوتا ہے کہ اس میں ہر فرد محسوس کرتا ہے کہ اس کی جان، مال، عزت، آبرو محفوظ ہے۔ اور یہی وہ احساس ہے جس سے اس کی زندگی امن اور سکون سے گزرتی ہے۔ اگر آپ کو ہر وقت دھڑکا لگا رہے کہ نہ معلوم آپ کا ہمسایہ کس وقت آپ کی عزت اور ناموس پر ہاتھ ڈال دے۔ اگر آپ کو ہر آن خطرہ رہے کہ راستہ چلنے والے نہ جانے کب آپ کی جان اور مال پر حملہ کر دیں تو آپ کی زندگی جس مسلسل عذاب میں گزرے گی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم جن لوگوں میں بستے ہیں ان کی طرف سے حفاظت کی ضمانت ہی وہ اطمینان ہے جس سے زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔ اگر یہ اطمینان اٹھ جائے تو جینا محال ہو جائے۔ قرآن حکیم نے انسانی معاشرہ کا جو بلند ترین نقشہ پیش کیا ہے اس کی اولین خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں افراد معاشرہ کے لئے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ اس میں ہر طرف سے سلامتی سلامتی کی آوازیں آئیں گی۔ اِلَّا قِيلًا سَلٰمًا سَلٰمًا۔ ایسے جنت بداماں معاشرہ کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے تکمیل پذیر ہونا تھا۔ اسی لئے حضور نبی اکرم نے فرمایا تھا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھوں اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔

آپ تہذیب و شائستگی کے اس تقاضے۔ آئین و ضوابط کے اس احترام، اور مسلمانوں کی اس تعریف (DEFINITION) کو سامنے رکھئے اور پھر اپنے معاشرہ پر ایک نظر ڈالئے اور غور کیجئے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ ہر روز صبح کے وقت آپ کے سامنے اخبار آتا ہے۔ اخبارات اور دیگر ذرائع رسل و رسائل، انسان کی ذہنی اور عملی ترقی کی ایک بین شہادت، اور انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ لیکن آپ اپنے ہاں کے اخبارات کو اٹھائیے اور دیکھئے کہ ان میں کس طرح ایک دوسرے پر کیچڑ پھینکا جاتا ہے۔ کس طرح شریف انسانوں کی پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں۔ بڑی بڑی جلی سرخیوں کے تابع اور رنگین چوکھٹوں کے اندر بڑے بڑے باعزت انسانوں اور شریف خواتین کے خلاف وہ کچھ لکھا جاتا ہے جس پر شرافت ماتم کرے اور حیا خون کے آنسو بہائے۔ اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ ان میں بیشتر

فرضی کہانیاں، اور خود تراشیدہ قصے ہوتے ہیں۔ ایک اخبار ہزاروں کی تعداد میں چھپتا اور لاکھوں نگاہوں سے گزرتا ہے۔ اس لئے جو سوختہ بخت شریف آدمی یا بدنصیب با عزت خاتون اس تہمت تراشی اور الزام بافی کا شکار ہو جاتی ہے، وہ گھنٹے کے اندر اندر دہ ملک کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں نفرت اور حقارت کا مجسمہ اور بے عزتی اور بے غیرتی کا پیکر بن کر رہ جاتی ہے۔ ان مظلوموں کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہوتا جس سے یہ اپنی چھنی ہوئی شرافت اور لٹی ہوئی عزت کو واپس لا سکیں۔ ان کذب بافیوں کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے لیڈروں اور ارباب نظم و نسق ملک کے متعلق عجیب و غریب جھوٹی خبریں، اور ان کی طرف منسوب کردہ، وضعی بیانات آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دن یہ شائع ہوتے ہیں اور دوسرے ہی دن اخبارات میں ان کی طرف سے ان کی تردید ہو جاتی ہے۔ یہ تردید اس لئے شائع ہو جاتی ہے کہ افراد متعلقہ با اثر لیڈر یا صاحب اقتدار حاکم ہوتے ہیں۔ لیکن عام لوگوں کی کوئی نہیں سنتا۔ وہ لاکھ چیخیں چلاتے رہیں، ان کے خلاف جھوٹی کہانیوں کی تردید کوئی شائع نہیں کرتا۔ اور کبھی کبھار کوئی شائع کرتا بھی ہے تو اس طرح کسی کونے کھدرے میں دبکی ہوئی کہ اس پر کسی کی نظر ہی پڑے۔ یہ فرضی کہانیاں معمولی نوعیت کی نہیں ہوتیں۔ ان میں بڑے بڑے سنگین جرائم کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی گھناؤنی بدکرداریوں کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے مکروہ الزامات لگائے جاتے ہیں۔ ایسی ایسی شرمناک باتیں منسوب کی جاتی ہیں جن کا کہیں وجود ہی نہیں ہوتا اور یہ سلسلہ مہینے کے تیس دن اور سال کے بارہ مہینے، مسلسل اور متواتر جاری رہتا ہے۔ رپورٹر خوش ہو جاتا ہے کہ اس کی حسن کارکردگی کی داد مل رہی ہے۔ مدیر ایڑی اونچی کر کے چلتا ہے کہ فلاں .... سے ایسا بدلہ لیا کہ .... عمر بھر یاد کرے گا (ان نقطوں کی جگہ آپ بے نقط گالیوں کا خود اضافہ کر لیجئے) مالکانِ اخبار پھولے نہیں سماتے کہ اخبار بڑا پاپولر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے کو بلا انداز سے جاری رکھا جاتا ہے کہ اخبار بین طبقہ کو اس قسم کی "سنسنی خیز" خبروں کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ اگر کسی دن اخبار میں یہ لذت افزا مسالہ نہ ہو تو اخبار بے حد پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پھیکا پن دو چار روز تک مسلسل چلے تو وہ کسی دوسرے اخبار کی تلاش کرتا ہے۔

یہ ہمارے معاشرے کا معمول بن چکا ہے ــــ اس معاشرہ کا جو "خدا کے فضل و کرم" سے مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

صبح کا اخبار چھوڑ کر آپ شام کو کسی جلسہ گاہ میں جائیے اور وہاں "قوم کے لیڈروں" کی تقریریں سنئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جب ایک شعلہ بیان مقرر سٹیج پر آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایسا مطلق العنان آمر ناطق سمجھتا ہے جو ہر قسم کی قیود سے نا آشنا اور ہر طرح کی حدود سے بالا ہوتا ہے۔ اسے لائسنس ملا ہوتا ہے کہ جس کے خلاف جو جی میں آئے بکے اور اس کے لئے جو زبان چاہے استعمال کرے۔ وہ اپنے مخالف کے خلاف تہمتوں پر تہمتیں

تراشتا، اور الزام پر الزام لگاتا چلا جاتا ہے۔ اس کی تقریر نہیں، ایک کف بردہاں سیلاب ہوتا ہے جس کے آگے سنجیدگی۔ متانت۔ شرافت۔ صداقت۔ سب خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جاتے ہیں۔ وہ اس کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتا کہ جو کچھ کسی کے خلاف کہتا ہے اس کی سند پیش کرے، یا جو الزام کسی کے سر دھرتا ہے اس کی کہیں سے تائید لائے۔ وہ فریقِ مخالف پر پھبتیاں کستا ہے۔ فقرے چست کرتا ہے۔ اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس کی تحقیر و تذلیل اور استخفاف و استہزاء میں نہ آدابِ معاشرت کا کوئی خیال کرتا ہے، نہ آئینِ آدمیت کا کوئی لحاظ۔ وہ جھوٹی تہمتوں اور فرضی کہانیوں سے عوام کے جذبات کو مشتعل کئے جاتا ہے اور محض زورِ زبان سے انہیں اس حد تک بھڑکاتا ہے کہ اگر اس کا فریقِ مخالف بدقسمتی سے جلسہ میں موجود ہو تو لوگ اس کی تکا بوٹی کر دیں۔ — وہ

وہ اس آتش فشانی میں حدود فراموش ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سے صدرِ جلسہ بھی لذت گیر ہوتا ہے اور سامعین بھی لطف اندوز۔ اور اس سے کوئی نہیں پوچھتا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، تمہیں اس کے اختیارات کہاں سے حاصل ہو گئے ہیں۔ بس اس کا اسٹیج پر آجانا اس کے لئے کافی لائسنس سمجھا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو ہم اور سامعین کو تم کہہ کر پکارتا ہے تو اپنے ذہن میں فرض کر لیتا ہے کہ وہ ایک حاکمِ اعلیٰ ہے، جسے بلا حدود و قیود ہر قسم کے اختیارات حاصل ہیں۔

ملک میں نفرت اور عداوت کی آگ بھڑکانے کا یہ سلسلہ ہر شام جاری رہتا ہے۔ آج ایک فریق اسٹیج پر یہ شعلہ فشانی کرتا ہے، کل اس کا فریقِ مخالف اس آگ پر اور تیل چھڑکتا ہے۔ شام کو مقامی جلسوں میں یہ کچھ ہوتا ہے۔ اور صبح کو یہی آتش گفتاری، اخبارات کے ذریعہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دی جاتی ہے۔

عام اجتماعات سے ہٹ کر اب ذرا اس مقام کی طرف آئیے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا (۳/۹۶)[1] جو اس میں داخل ہو گیا اسے امن مل گیا۔ اس گوشۂ امن و سکون کی حالت یہ ہے کہ خطیب منبر پر سرفراز ہے۔ ہاتھ میں خدا کی کتاب ہے اور وہ اپنے آپ کو نائبِ رسول کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے۔ تلاوتِ آیات اور درود و صلوٰۃ کے بعد خطبہ شروع ہوتا ہے۔ اگر وہ شروع قدامت پسندانہ ہے تو مقابل کا پورے کا پورا فرقہ، ہدفِ طعن و تشنیع بننا شروع ہو جاتا ہے۔ اختلاف خواہ اتنا سا ہی کیوں نہ ہو کہ آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیئے یا آہستہ۔ لیکن فریقِ مخالف کو خدا کا منکر۔ دشمنِ رسول اللہ کا مخالف۔ دین کا دشمن۔ ائمہ کرام کی شان میں گستاخی کا مرتکب۔ گمراہ ... ملحد ... جتھہ کا بندھن ... کیا کیا قرار دیا جا رہا ہے ... کے

---

[1] اگرچہ قرآن میں یہ آیت مسجد الحرام کے ضمن میں آئی ہے لیکن اس کا اطلاق ہر مسجد پر ہو سکتا ہے۔

لہٰذا اس فرقے کے تمام افراد سے معاشرتی تعلقات منقطع کرنے کو از روئے شریعت واجب بتایا جائے گا۔ ان کے متعلق کہا جائے گا کہ ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔ غرضیکہ مخالف فرقے کے خلاف عداوت اور منافرت کے جذبات کو اس قدر مشتعل کیا جائے گا کہ سامعین کی آنکھوں میں خون اتر آئے گا۔

یہ قدامت پرستانہ مسلک کا مظاہرہ ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں، بدقسمتی سے سیاست مذہب کا نقاب اوڑھ کر سامنے آتی ہے۔ اس میں یہ آتش فشانیاں اپنی انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس میں بنیادی تعلیم دی جاتی ہے کہ مقدس مقاصد کے حصول کے لئے جھوٹ بولنا اور فریب کاری سے کام لینا بڑے ثواب کا کام ہے۔ لہٰذا خطیب، فریقِ مخالف کے خلاف ایسے ایسے الزام تراشتا، اور اس قسم کی تہمتیں لگاتا ہے جس سے زمین کا کلیجہ شق ہو جائے اور آسمان کانپ اٹھے۔ کبھی نہایت اشتعال انگیز باطل عقائد اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ کبھی فرضی واقعات گھڑ کر اس کی سیرت و کردار کو نہایت گھناؤنے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی اسے (معاذ اللہ) ناموسِ رسالتؐ کا بدترین دشمن ٹھیرایا جاتا ہے۔ کبھی اسے بزرگانِ کرامؒ کی شان میں شرمناک گستاخیوں کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اپنے ذاتی انتقام کی خاطر کیا جاتا ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے خدا اور رسول کے نام پر اور "حفاظتِ دین" کی سپر کے پیچھے۔ ایسا کہنے والے کی پوزیشن اسٹیج کے مقرر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ محفوظ و مامون ہوتی ہے۔ اسٹیج کے مقرر کے سلسلے میں ہو سکتا ہے کہ سامعین میں کوئی اسے کسی مقام پر ٹوک دے۔ لیکن منبر کا خطیب سب سے پہلے یہ مسئلہ سنا دیتا ہے کہ خطبہ کے دوران بولنا تو ایک طرف، نماز تک پڑھنا بھی جائز نہیں۔ اس لئے وہ جو جی میں آئے کہتا چلا جائے، کسی کی مجال نہیں کہ اسے ٹوک سکے۔ جب وہ ان اختراعات و کذوبات سے اپنا جی بھر لیتا ہے تو پھر نماز کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کسی کو موقع ہی نہیں مل سکتا کہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکے ویسے بھی اس نے اپنے سامعین کے نازک ترین جذبات کو بھڑکا کر اس قسم کی فضا پیدا کر رکھی ہوتی ہے کہ وہاں بولنا موت کو آواز دینے سے کم نہیں ہوتا۔

اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ اگر آپ کو ایک جلسہ منعقد کرنا ہو تو اس کے لئے کس قدر انتظامات کرنے پڑتے ہیں — جگہ کا انتظام، نشستوں کا انتظام، سایہ کا انتظام، روشنی کا انتظام، لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی اجازت کا حصول، اشتہارات، اخباروں میں اعلانات، غرضیکہ ہزار قسم کے اہتمامات کے بعد کہیں جا کر ایک اجتماع منعقد کیا جا سکتا ہے لیکن جمعہ کے اجتماع اور خطبہ کے لئے آپ کو کسی قسم کے اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لوگ خود بخود کشاں کشاں چلے آ رہے ہیں۔ مسجد کے اندر جگہ نہیں ملتی تو باہر سڑک پر بیٹھے ہیں۔ سائبان نہیں

تو چلچلاتی دھوپ میں سرنگوں محو سماعت ہیں کسی کے دل میں احساس شکوہ نہیں کسی کے لب پر حرف شکایت نہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ ساکت و صامت بیٹھا ہے۔

پھر اسے بھی ذرا ذہن میں رکھئے کہ یہ اجتماع کسی ایک جگہ منعقد نہیں ہو رہا ہوتا۔ ملک کے ہر قریہ اور ہر بستی میں۔ اور ہر کوچہ اور ہر محلہ کی مسجد میں، ان اجتماعات کا بیک وقت انعقاد ہوتا ہے۔ غور کیجئے کہ جو سیاسی گروہ اس قسم کی تنظیم کو اپنے قبضہ میں لے لے، وہ اس کے ذریعہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ دنیا میں پراپیگنڈا کی کوئی مشینری اس تنظیم کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

آپ سوچئے کہ جس معاشرہ میں حالات ایسے ہوں اس میں کوئی شخص بھی سکھ کی نیند سو سکتا ہے؟ اور جس ملک میں چاروں طرف سے یوں نفرت پھیلائی جا رہی ہو اس میں کسی کو بھی سکون میسر آ سکتا ہے۔

اس صورت حال کا نقصان یہی نہیں کہ کوئی فرد اپنے آپ کو محفوظ و مامون محسوس نہیں کرتا۔ اس کا سب سے زیادہ مضر اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ قوم کی دولت۔ وقت اور توانائیاں تخریبی کوششوں میں ضائع ہوتی رہتی ہے۔ جس قوم کے دل میں مسلسل اور متواتر نفرت کی آگ سلگائی اور بھڑکائی جائے، وہ کبھی کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتی۔ اس کی نفسیاتی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں کی برائیاں سننے میں لذت لیتی ہے، اور کسی کے محاسن کی طرف اس کی نگاہ ہی نہیں اٹھتی۔ تنقید، تنقیص، نکتہ چینی، عیب جوئی، اس کی مستقل عادت ہو جاتی ہے۔ آپ کسی تعمیری پروگرام کی طرف دعوت دیں تو دس آدمی بھی اکٹھے نہیں ہوں گے لیکن تخریب کے لئے آواز دیں تو ہزاروں کا اجتماع ہو جائے گا۔ یہ نفرت کا خاصہ ہے۔ اگر آپ کسی سے محبت کریں، اور کوئی دوسرا بھی اس سے محبت کرے، تو آپ اسے اپنا رقیب سمجھیں گے۔ لیکن اگر آپ کسی سے نفرت کریں اور کوئی دوسرا بھی اس سے نفرت کرے تو اسے آپ اپنا دوست قرار دیں گے۔ اگرچہ اس قسم کی دوستی کی عمر برق کی چمک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نفرت کی بنیاد پر آپ بڑی آسانی سے ہنگامے برپا کرا سکتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کی قوم عادۃً ہنگامہ خیز ہو جاتی ہے۔ ہماری اس وقت یہی حالت ہو چکی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پریس، پلیٹ فارم اور منبر ہر جگہ سے نفرت ہی نفرت پھیلائی جاتی ہے۔ ممکن ہے آپ کہہ دیں کہ یہ آزادی کا زمانہ ہے۔ اظہار خیالات کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ آپ اس پر پابندی کس طرح لگا سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اظہار خیالات کا حق ہر شخص کو حاصل ہے، لیکن ذرا دل تو یہ سوچئے کہ اظہار خیالات کی آزادی کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ آپ جھوٹ، سچ، جو جی میں آئے کسی کے خلاف بکتے چلے جائیں۔ اور آپ کو کوئی ٹوکنے والا ہی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ان حالات میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اظہار خیالات کا حق صرف ان لوگوں کی اجارہ داری بن کر رہ جاتا ہے جن کے پاس پراپیگنڈہ کی مشینری ہے

باقی لوگوں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے وہ اپنے خیالات کا اظہار تو ایک طرف، اپنی مدافعت یا برءیت ہی کر سکیں۔ یہ بدترین قسم کا استبداد ہے جو کسی قوم کے عام طبقہ پر مسلط ہوتا ہے۔ اس میں قوم کی اکثریت کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ اور ہر شخص ان لوگوں سے ڈرا ڈرا اور سہما سہما رہتا ہے جن کے ہاتھ میں پراپیگنڈہ کے ذرائع ہوتے ہیں۔ اس ڈر اور خوف کا نتیجہ ہے کہ قوم میں منافقت عام ہو جاتی ہے۔ ہمیں اکثر ان لوگوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے جو ملک میں نفرت پھیلانے والے طبقہ کی ان کارروائیوں کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ بند کمرے کے اندر رازدارانہ انداز سے ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ باہر نکل کر، ان لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانے پر آپ اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جب کسی قوم پر اس قسم کی دہشت مسلسل طاری رہے تو اس کے قوائے فکر و عمل کی حالت کیا ہو جائے گی۔؟

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے! آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک فرد کم از کم اپنی عزت کی حفاظت کے لئے قانون کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ لیکن اس دروازے کے کھٹکھٹانے کے بعد وہ جن قدر پریشانیوں کا شکار ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں اس کا عملی تجربہ ہوا ہو۔ ویسے بھی، جب معاملہ کسی ایک آدھ فرد تک محدود ہو تو اس قسم کے اقدامات مفید نتائج مرتب کر سکتے ہیں۔ لیکن جب سارے معاشرہ میں یہی کچھ ہو رہا ہو تو اس کا علاج انفرادی طور پر کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کا علاج اولاً حکومت کر سکتی ہے اور ثانیاً خود معاشرہ۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ملک میں اس قسم کا قانون ہونا چاہیئے کہ جو شخص کسی کے خلاف کچھ کہے، شخصِ متعلقہ کی سادہ شکایت پر حکومت اس کہنے والے سے مطالبہ کرے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس کی سند پیش کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اسے اس غلط بیانی کی سزا دی جائے۔ اس سے کم از کم الزام تراشیوں اور کذب بافیوں کا تو کسی حد تک سدباب ہو سکے گا۔ لیکن اس سلسلے میں اس سے زیادہ موثر کام خود معاشرہ کر سکتا ہے۔ اور وہ یوں کہ جو شخص کسی کے خلاف کچھ کہے ہر فرد اس سے مطالبہ کرے کہ وہ اس کی سند پیش کرے۔ اگر وہ بات اخبار میں آتی ہے تو اس کے قارئین اس سے کہہ دیں کہ اگر وہ اپنے بیان کے ثبوت میں سند پیش نہیں کرے گا تو اخبار کا بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہ مقرر یا خطیب ہے تو اس سے برملا کہہ دیا جائے کہ اگر وہ اپنی بات کو مستند ثابت نہیں کرے گا تو اس کی کوئی بات نہیں سنی جائے گی۔ اگر افراد معاشرہ اتنی سی جرأت سے کام لیں تو اس سے حالات بڑی حد تک سنور سکتے ہیں۔ مسلمان کے لئے تو اس کے خدا کا حکم یہ ہے کہ:-

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ
كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ (۱۷/۳۶)

جس بات کا تجھے علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو سماعت۔ بصارت اور قلب، ہر ایک سے اس بات کے متعلق باز پرس ہوگی۔

دیکھئے کہ اس سے ہر فرد معاشرہ پر بات کی خود تحقیق کرنے کی کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کسی کے خلاف کسی بات کو بلا تحقیق مان لینا تو ایک طرف، وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ (وَلَا تَجَسَّسُوْا — (۴۹/۱۲) خواہ مخواہ کسی کی باتوں کی ٹوہ میں مت رہو۔ وہ تاکید سے کہتا ہے کہ جب کوئی شخص تمہارے سامنے کسی کے خلاف کوئی بات کہے تو تمہارا پہلا ردعمل یہ ہونا چاہیئے کہ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶) یہ اس کے خلاف بہت بڑا بہتان ہے۔ مَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا۔ (۲۴/۱۶) ہمارے لئے یہ مناسب ہی نہیں کہ ہم اس بات کا آگے ذکر کریں۔ حتیٰ کہ اگر وہ بات ایسی ہے جس سے قوم کو کسی اجتماعی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے تو اس کے متعلق بھی کہا کہ بجائے اس کے کہ اسے تم اپنے طور پر پھیلاتے پھرو، اسے ذمہ دار حلقہ تک پہنچاؤ تاکہ وہ تحقیق کے بعد بات کی تہ تک پہنچ سکیں۔ اور پھر اس کے متعلق مناسب کارروائی کریں (۴/۸۳)

یہ ہیں قرآن کے احکام۔ اس کے برعکس ہماری حالت یہ ہے کہ نہ بات کرنے والا غلط بیانی، تہمت تراشی، اور کذب بافی کے وقت ذرا بھی دل میں خیال کرتا ہے کہ مجھ سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی اور نہ ہی اس بات کے سننے والے اس کا احساس کرتے ہیں کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ بات کی تحقیق کے بعد اسے تسلیم کریں اور جب تک الیسا نہ کرلیں جس کے خلاف وہ بات کہی گئی ہے اس کے خلاف بدظنی سے کام نہ لیں کہ بدظنی بہت بڑا گناہ ہے (۴۹/۱۲)

لیکن جب یہ غلط بیانیاں اور تہمت تراشیاں خود "خدا اور رسول" کے نام پر کی جائیں تو عوام سے یہ توقع کس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کا خیال کریں گے — چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یتیم پوتے کی وراثت

جن عائلی قوانین (FAMILY LAWS) کو منسوخ کرانے کے لئے آجکل ایجی ٹیشن کی جارہی ہے ان میں ایک قانون یہ بھی ہے کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے حصہ ملنا چاہیئے۔ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت اگست ۱۹۶۲ء) میں ہم نے عائلی قوانین کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ ان میں سے بعض شقیں ہنوز قرآن کریم سے پیچھے ہیں لیکن ان میں سے کوئی قانون بھی قرآن مجید کے خلاف نہیں اور جو قانون قرآن کے خلاف نہیں ظاہر ہے کہ وہ کبھی اسلام کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان قوانین کی تنسیخ کا مطالبہ صحیح نہیں۔

اسی سلسلہ میں ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم کر دینا قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے چونکہ یہ چیز عائلی قوانین کے سلسلہ میں ضمناً سامنے آئی تھی اس لئے اس پر مختصراً لکھا جا سکا تھا۔ اب قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہوئے ہیں کہ اس خاص موضوع پر تفصیل سے لکھا جائے کیونکہ یہ قانون بڑا اہم ہے ملک میں ہزاروں گھرانے ہیں جو اس قانون کی تنسیخ سے خانماں خراب اور تباہ و برباد ہو جائیں گے جس سے پورا پورا اتفاق ہے اس لئے اس کی وضاحت پیش خدمت ہے۔ واضح رہے کہ وراثت کا مسئلہ بڑا فنی سا ہے لیکن ہم نے ذیل کی سطور میں کوشش کی ہے کہ اسے عام فہم الفاظ میں پیش کیا جائے۔

مسئلہ کی نوعیت ۲- پہلے اس مسئلہ کی نوعیت سمجھ لیجئے۔ اس کے لئے ذیل کا نقشہ سامنے رکھئے۔

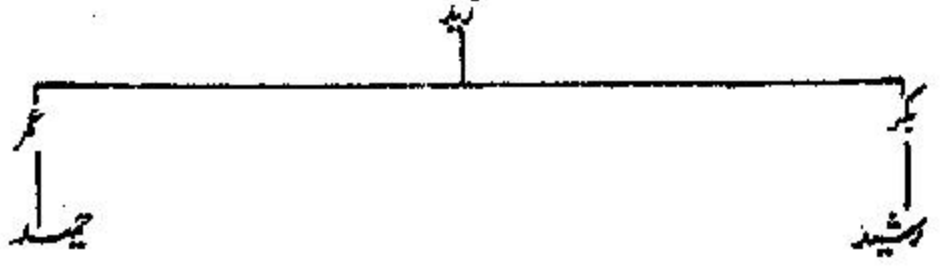

ظاہر ہے کہ زید کی وفات پر اس کی جائداد اس کے بیٹوں (بکر اور عمر) میں تقسیم ہوگی۔ پھر بکر کی وفات پر یہ رشید کے حصے میں آئے گی، اور عمر کے مرنے پر اس کا ترکہ حمید کو ملے گا۔ یہاں تک بات بالکل صاف ہے۔

لیکن اگر زید کی زندگی میں بکر وفات پا جاتا ہے (اور رشید یتیم رہ جاتا ہے) تو ہمارے قدامت پسند طبقہ (حضرات علمائے کرام) کے پیش کردہ قانون شریعت کی رو سے زید کی ساری جائداد عمر کو مل جائے گی (اور عمر کے بعد اس کے بیٹے حمید کو) رشید کو اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔

پس منظر یہ کیوں؟ اس لئے کہ رشید بچارا یتیم ہے!

۳۔ تشکیل پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں طلوع اسلام نے یتیموں کو ان کا حق دلانے کے لئے قدم اٹھایا اور یہ ثابت کیا کہ ——— ہمارا مروجہ قانون جس کی رو سے یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم کر دیا جاتا ہے قرآن کریم کے یکسر خلاف ہے اس لئے اسے منسوخ قرار دے کر قرآن مجید کا صحیح قانون نافذ کرنا چاہیئے۔ ملک کے مظلوم طبقہ کی طرف سے حق و انصاف کی اس آواز کی پرجوش تائید ہوئی۔ ارباب علم و بصیرت نے اس کی پوری پوری حمایت کی۔ قرآنی نظام و قوانین کے حامیوں اور رشید انیوں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا ——— لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے بیحد تعجب و تاسف ہوگا کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اس مخالفت میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سب سے پیش پیش تھے۔ طلوع اسلام نے ان کے اعتراضات کا بھرپور جواب دیا اور قرآنی شہادات اور عقلی دلائل سے بتایا کہ ان کا پیش کردہ مسلک کس قدر دین و دانش دونوں کے خلاف ہے (ملاحظہ ہو طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ بعنوان ۔ یتیم پوتے کی وراثت)

۱۹۵۴ء میں محترم محمد اقبال چیمہ صاحب کی طرف سے پنجاب اسمبلی میں ایک مسودہ قانون پیش ہوا جس میں یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکے سے حصہ دلانے کی تجویز تھی۔ مودودی صاحب کی طرف سے اس کی بھی مخالفت ہوئی۔ (جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ بل بعض فنی وجوہات کی بنا پر اسمبلی میں زیر بحث نہیں آسکا تھا۔)

موجودہ قانون جب حکومت پاکستان کی طرف سے عائلی کمیشن کا تقرر ہوا تو اس نے بھی اس سوال کو اپنے سامنے رکھا۔ طلوع اسلام ——— اور ملک کے دوسرے معقولیت پسند طبقہ کی طرف سے اس کا مطالبہ کیا گیا کہ ان یتیموں کو ان کا حق ضرور دلایا جائے جو انہیں قرآن کی رُو سے ملتا ہے کمیشن نے اسے اپنی سفارشات میں شامل کر لیا۔ اور جب ان سفارشات کو عملی جامہ پہنایا گیا تو صدر مملکت کی طرف سے اسے ایک قانون کی شکل میں نافذ کر دیا گیا۔ ان محروم الارث یتیموں نے پاکستان کو ہزار ہزار دعائیں دیں۔ اور ملک میں صحیح اسلامی قوانین کو رائج دیکھنے کے متمنی طبقہ نے بحضور رب العزت سجدۂ شکرانہ ادا کیا کہ صدیوں کے بعد ایک غیر قرآنی قانون کی جگہ صحیح اسلامی قانون نافذ ہوا۔

اس وقت مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ نے ان (عائلی) قوانین کے نفاذ پر حکومت کو تو کچھ نہ کہا لیکن اپنا سارا غصہ طلوعِ اسلام کے خلاف نکالا ان کی طرف سے پرویز صاحب اور ان سے متفقین حضرات کے خلاف کفر کا فتویٰ اس غم و غصہ کا مظاہرہ تھا۔ چنانچہ اس فتویٰ کے ضمن میں (مولوی) محمد رشید لدھیانوی

کفر کا فتویٰ

صاحب اپنے پمفلٹ (مسٹر پرویز کا خط اور اس کا جواب) میں طنزاً لکھتے ہیں:۔

یہ ان کے (مسٹر پرویز کے) لئے کچھ کم اعزاز کی بات نہیں کہ انھوں نے یتیم بیٹے کا حق کاٹ کر (؟) یتیم پوتے کو وارث بنانے پر اپنا زورِ قلم صرف کیا اور ملک میں اس کو قانونی شکل حاصل ہو گئی۔

دیگر عائلی قوانین کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

اسی طرح مسٹر پرویز کی یہ دعوت بھی رائگاں نہیں گئی کہ

طلاق میں بھی انفرادی اختیار نہیں ہے۔ میاں بیوی کی باہمی شکر رنجی کی صورت میں عدالت پہلے ثالث مقرر کرے گی اور ان ثالثوں کی رپورٹ کے بعد وہ فیصلہ دے گی کہ باہمی مدافعت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے یا انقطاع تعلقات ناگزیر ہے۔ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ جب چاہے اٹھ کر عورت کو طلاق دے دے۔

تنسیخ کا مطالبہ

مارشل لاء اٹھ جانے کے بعد ان حضرات کی طرف سے سب سے پہلا مطالبہ یہ پیش ہوا ہے کہ ان (عائلی) قوانین کو منسوخ کیا جائے اور یتیم پوتوں کو ان کے دادا کے ورثہ سے محروم قرار دیا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے ہماری نیشنل اسمبلی کے سب سے پہلے اجلاس میں ایک مسودہ قانون بھی پیش کر دیا گیا۔ کس قدر قابلِ مبارکباد ہے یہ قدم جو ان حضرات کی طرف سے اٹھایا گیا ہے۔

آسماں راحق بود گر خوں ببارد برزمیں!

قرآن کی رُو سے پوزیشن

۴۔ قرآن نے وراثت کے احکام خود متعین کر دیئے ہیں۔ موضوع زیرِ نظر کے ضمن میں سورۂ نساء کی حسب ذیل آیات غور طلب ہیں۔

(۱) لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ ..... (۴/۷)

(۲) يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ..... (۴/۱۱)

پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ جو کچھ "والدین" چھوڑ کر مریں اس کی تقسیم یوں ہوگی۔ دوسری آیت میں ہے کہ اللہ تمہیں تمہاری "اولاد" کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ ان میں ترکہ کی تقسیم یوں کی جائے۔ یہی دو لفظ "والدین"

اور "اولاد" ہیں جن کا صحیح مفہوم سمجھ لینے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں "والدین" سے مراد "ماں باپ" لئے جاتے ہیں اور "اولاد" سے "بیٹے بیٹیاں"۔ لیکن عربی زبان میں ان الفاظ کا یہ محدود مفہوم نہیں اس میں "والدین" سے مراد باپ۔ دادا۔ پردادا۔ اور اوپر تک سب ہوتے ہیں۔ اسی طرح "اولاد" میں بیٹے۔ پوتے۔ پرپوتے نیچے تک سب شامل ہوتے ہیں۔ خود ہماری کتب تفاسیر اور احادیث میں بھی یہ مفہوم موجود ہے (مثلاً)

"اولاد" کے مفہوم

تفسیر خازن میں آیت "ولھن الربع مما ترکتم" کے ذیل میں لکھا ہے:۔

اسم الولد یطلق علی الذکر والانثی و لا فرق
بین الولد ولد الابن و ولد البنت فی ذالک۔

ولد کا لفظ مذکر اور مونث دونوں کے لئے بولا جاتا ہے اور اس میں
اولاد اور بیٹے کی اولاد اور بیٹی کی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔

فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۱۲ صفحہ ۸ مطبوعہ مصر میں ہے:۔

الولد اعم من الذکر والانثی ویطلق علی الولد الصلب
وعلی ولد الولد وان سفل۔

ولد کا لفظ مذکر اور مونث دونوں سے عام ہے اور صلبی اولاد اور
نیچے تک اولاد کی اولاد پر بولا جاتا ہے۔

فقہا بھی اس شرح کے ساتھ متفق ہیں اور ولد میں ولد الابن کو داخل سمجھتے ہیں شرح سراجی صفحہ ۲۶۶ مطبوعہ یوسفی لکھنؤ میں ہے۔

ولد الابن داخل فی الولد لقولہ تعالیٰ یا بنی آدم
اولاد میں بیٹے کی اولاد بھی داخل ہے کیونکہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کہا ہے

آیت توریث میں جہاں جہاں بھی ولد کا لفظ آیا ہے ہر جگہ بالاتفاق فقہا نے نیچے تک تمام اولاد نرینہ کو اس میں داخل سمجھا ہے۔ مثلاً:۔

فان کان لھن ولد فلکم الربع مما ترکن
اگر ان کی (تمہاری بیویوں کی) کوئی اولاد ہو تو ان کے ترکہ
میں سے تم کو چوتھائی ملے گا۔

فقہا میں سے ایک نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ بیویاں جب صلبی بیٹا یا بیٹی چھوڑ کر مریں اس وقت شوہروں کو چوتھائی ملے گا بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ وہ پوتا، پوتی، پڑوتا، پڑوتی کسی کو بھی اگر چھوڑیں تو شوہر کو چوتھائی ملے گا۔

اولاد تو پھر بھی ایک عام لفظ ہے۔ ابن و بنت کے الفاظ جو عربی زبان میں خاص بیٹا بیٹی کے لئے وضع کئے گئے ہیں وہ بھی قرآن میں کئی جگہ وسیع معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں اور نیچے تک کی تمام اولاد کو شامل ہیں۔ جا بجا اللہ تعالیٰ نے ہم کو "یا بنی آدم" کہہ کر خطاب کیا ہے۔ بیسیوں نسلیں حضرت یعقوبؑ کی گزر گئیں لیکن ان کی اولاد قرآن میں "یا بنی اسرائیل" کہہ کر پکاری گئی۔

دور کیوں جایئے خود آیت وراثت ہی کے ایک رکوع کے بعد ہے حرمت علیکم امہاتکم وبناتکم۔ یہاں بنات کے لفظ کو تمام فقہا نے بیٹیوں، پوتیوں، پڑپوتیوں۔ یہاں تک کہ نواسیوں پر بھی شامل کیا ہے اس لئے آیت وراثت میں جو اولاد کا لفظ ہے اس میں یقیناً پوتا داخل ہے اور کسی طرح خارج نہیں ہو سکتا۔

اور یہ مجازاً نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ہے جیسا کہ علامہ ابوبکر ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے۔ کیونکہ ولد کا لفظ ولادت سے مشتق ہے۔ اس لئے اولاد کی اولاد بھی حقیقتاً اولاد ہے جس طرح کہ جز کا جز بھی یقیناً جز ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے عملی شکل کیا پیدا ہوگی۔

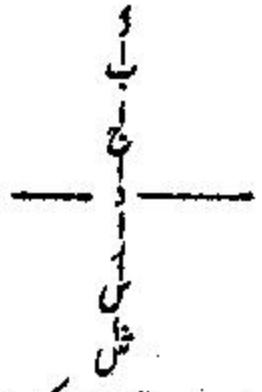

(ج)۔ (ب)۔ (ا) سب (د) کے "والد" ہیں اور (د)۔ (س)۔ (ش) سب اس کی "اولاد" ہیں۔ اس لئے (ا)۔ (ب)۔ (ج) میں سے ہر ایک کا ترکہ (د) کو ملے گا۔ اسی طرح (ش)۔ (س)۔ (ر) میں سے ہر ایک کا ترکہ (د) کے حصے میں آئے گا۔

لیکن اس میں ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ اگر (ا) کی وفات کے وقت (ب) زندہ ہے تو (ا) کا ترکہ (ج) یا (د) تک نہیں پہنچے گا۔ وہ (ب) ہی کو ملے گا۔ ہاں اگر اس وقت (ب) اور (ج) دونوں میں سے کوئی زندہ نہ ہو تو (ا) کا ترکہ (د) کو ملے گا۔ اسی طرح اگر (ش) کی وفات کے وقت (س) اور (ر) زندہ ہیں تو (ش) کا ترکہ (د) کو نہیں ملے گا۔ ہاں اگر اس وقت (س) اور (ر) میں سے کوئی زندہ نہ ہو تو پھر (ش) کا ترکہ (د) کو مل جائے گا۔ یہ ہے "والدین" کے ترکہ میں سے "اولاد" اور "اولاد" کے ترکہ میں سے "والدین" کے حصہ پانے کا قرآنی اصول۔

اس اصول کی روشنی میں اب پھر پہلی شکل کو سامنے لایئے یعنی

اگر زید کی وفات کے وقت بکر اور عمر زندہ ہیں تو زید کا ترکہ رشید اور حمید تک نہیں پہنچے گا۔ بکر اور عمر کو ملے گا۔ لیکن اگر زید کی وفات کے وقت بکر اور عمر موجود نہیں (اس سے پہلے وفات پا چکے ہیں) تو زید کا ترکہ رشید اور حمید کو ملے گا۔

اصل سوال اب اصل سوال کی طرف آیئے۔ زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جاتا ہے اور رشید یتیم رہ جاتا ہے اس کے بعد زید وفات پا جاتا ہے۔ قرآنی اصول کے مطابق زید کا ترکہ عمر اور رشید میں تقسیم ہونا چاہیئے۔ کیونکہ دونوں زید کی اولاد ہیں اور ان کے اور زید کے درمیان کوئی اور حائل نہیں لیکن ہمارے علماء حضرات کا ارشاد ہے کہ نہیں! زید کی کل جائداد عمر کو ملے گی۔ رشید کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور عمر کی وفات کے بعد وہ جائداد حمید کو مل جائے گی۔ آپ غور کیجئے کہ یہ فیصلہ کس قدر قرآن کریم کے خلاف ہے۔ آپ یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ اگر یتیم پوتے (رشید) کی وفات ہو جائے تو (ان حضرات کے فیصلے کے مطابق) اس کے ترکہ میں سے زید (دادا) کو وہی حصہ مل جائے گا جو رشید کے والد بکر کو ملتا (اگر وہ زندہ ہوتا) یعنی یتیم پوتے کے ترکہ میں سے دادا کو تو حصہ مل جائے گا لیکن دادا کے ترکہ میں سے یتیم پوتے کو حصہ نہیں ملے گا۔ یا للعجب! یاد رکھیئے قرآن کریم کی رُو سے زید کے ترکہ میں سے جو حصہ رشید کو ملتا ہے وہ اس کے مرحوم باپ (بکر) کا حصہ نہیں۔ بکر کی وفات کے بعد رشید براہ راست زید کا "ولد" ہو جاتا ہے اس لئے اسے بہ حیثیت ولد کے والد (یعنی دادا) کی وراثت کا حصہ ملے گا۔ جیسا ولد عمر ہے ویسا ہی ولد رشید ہے۔

ایک سے زیادہ پوتے یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لئے ذیل کا نقشہ دیکھئے۔

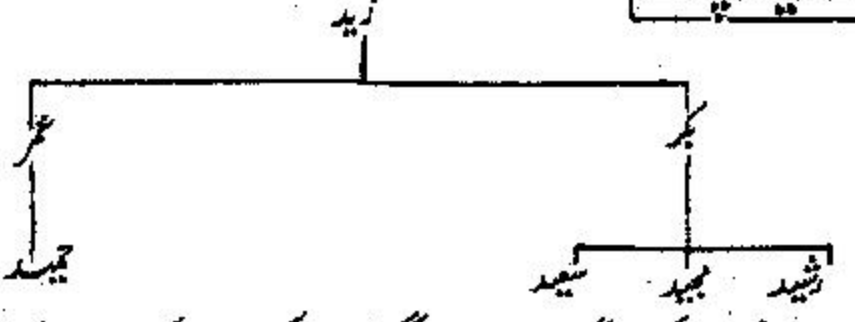

بکر اور عمر دونوں زید کی زندگی میں وفات پا گئے۔ یعنی زید کی وفات کے وقت رشید، مجید، سعید (تینوں بھائی) اور حمید (عمر کا بیٹا) سب یتیم تھے۔ علماء حضرات کا فیصلہ ہے کہ ایسی صورت میں زید کے ترکہ کے چار برابر حصے کئے جائیں۔ تین حصے رشید، مجید، سعید کو دے جائیں اور ایک حصہ حمید کو۔ یہ بھی غلط ہے۔ حمید کیوں اس لئے نقصان میں رہے کہ

بنیادی اُصول اس کا باپ (عمر) اس کے دادا (زید) کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا؟ اصول یہ ہے کہ زید کی زندگی میں اس کے بیٹوں میں سے کسی کی وفات، اس کے یتیم پوتوں میں سے کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔

اس اصول کے مطابق زید کے ترکہ کے دو برابر حصے کئے جائیں گے آدھا حمید کو ملے گا اور باقی نصف رشید، مجید اور سعید میں تقسیم ہو جائے گا۔

یہ ہے مختصراً قرآن کی رُو سے صحیح پوزیشن۔ یعنی اگر بکر زید کی زندگی میں فوت ہو جائے تو زید کا کل ترکہ عمر کو نہیں ملے گا بلکہ اس میں سے اس کے یتیم پوتے (رشید) کو بھی آدھا ملے گا۔ اس کی مخالفت ہمارے علماء حضرات کی طرف سے ہو رہی ہے اس ضمن میں ان کے دلائل ملاحظہ فرمائیے۔ مودودی صاحب نے (ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۲ء میں) لکھا تھا۔

مودودی صاحب کے اعتراضات

فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بناء قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے ویسے بھی یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کیونکہ پوتا بہرحال اپنے باپ کے واسطے ہی سے دادا کے مال میں حق دار ہو سکتا ہے نہ کہ براہ راست خود۔ اسی طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے سے خسر کے مال میں سے حصہ پا سکتی ہے نہ کہ براہ راست خود۔ اگر ایک شخص کا بیٹا اس کی زندگی میں مر جائے اور وہ شادی شدہ نہ ہو تو آپ خود مانیں گے کہ اس کا حصہ ساقط ہو جائے گا یہ نہیں کہ اس شخص کے مرنے پر اس کے ترکے میں سے اس کے فوت شدہ بیٹے کا حصہ بھی نکالا جائے اور پھر اس کی میراث اس کی ماں اور اس کے بھائیوں وغیرہ کو پہنچائی جائے۔ اسی طرح اگر فوت شدہ لڑکے کی کوئی بیوی موجود ہو تو آپ خود مانیں گے کہ وہ اپنے خسر کے ترکے میں سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نکاح ثانی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ پھر آپ کو کیوں اصرار ہے کہ صرف اس کا بیٹا موجود نہ ہونے کی صورت میں اس کا حصہ ساقط نہ ہو بلکہ وہ اس کے بیٹے کو پہنچے۔

اس کے جواب میں ہم نے یہ لکھا تھا کہ

جواب | مودودی صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہیں قرآن و حدیث میں کوئی

ایسا حکم صریح نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جا سکے لیکن اس کے باوجود وہ فرماتے ہیں کہ بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے لے کر خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ یہی وہ تقلید ہے جس کی قرآن شدت سے مخالفت کرتا ہے اور جس کی وجہ سے قوموں میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ خود مودودی صاحب اپنی بیشتر تحریروں میں لکھ چکے ہیں کہ جن معاملات میں قرآن و حدیث خاموش ہوں انہیں ہم اپنی بصیرت سے حل کریں گے اس چیز کو انہوں نے دستور پاکستان کے اس خاکے میں بھی بیان کیا ہے جو ان کی طرف سے مرتب ہو کر شائع ہوا تھا لیکن اب ان کا ارشاد ہے کہ جو امور سلف سے خلف تک وراثتاً منتقل ہوتے چلے آئے ہیں ان کے خلاف رائے دینا مشکل ہے خواہ ان کی تائید میں قرآن و حدیث کا کوئی حکم بھی نہ ملے۔

عقلی دلائل اس کے بعد مودودی صاحب نے اس مسلک کی تائید میں دلائل لا کر (بزعم خویش) ثابت کیا ہے کہ یہ مسلک معقول بھی ہے اب ان کے دلائل اور ان کی معقولیت کو دیکھئے۔ دلیل یہ ہے کہ

(i) پوتا اپنے باپ کے واسطے ہی سے دادا کے مال میں حق دار ہو سکتا ہے نہ کہ براہ راست جس طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے ہی سے خسر کے مال میں حصہ پا سکتی ہے۔

(ii) فوت شدہ وارث کا حصہ نہیں نکالا جاتا۔ اس لئے یتیم پوتا اپنے دادا کے مال سے حصہ نہیں پا سکتا۔

یہ دلائل عقل، علم اور قرآن سب کے خلاف ہیں۔ حتیٰ کہ فقہی قانونِ وراثت کے خلاف بھی۔

مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ پوتا اپنے باپ کے واسطہ سے ہی مال میں حقدار ہو سکتا ہے اور جب واسطہ نہ رہے تو یہ حق ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ دعویٰ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ذرا اس نقشے کو سامنے لائیے جو پہلے پیش کیا جا چکا ہے

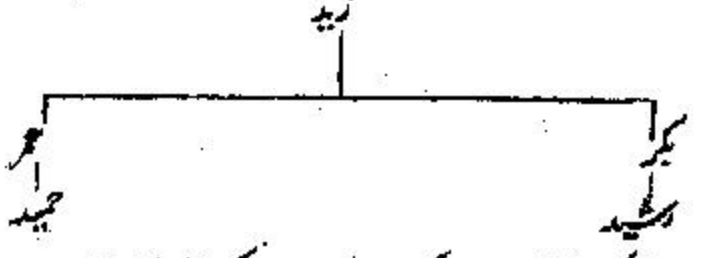

مودودی صاحب کے دعویٰ کی بنا پر حمید عمر کے واسطے سے زید کے مال کا حق دار ہے اور رشید اس لئے زید کے

مال کا حق دار نہیں کہ اس کا واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا عمر کی موجودگی میں حمید اپنے دادا (زید) کے مال سے ایک پائی بھی پا سکتا ہے۔ عمر کی موجودگی میں زید کے مال کا حق دار عمر ہی ہے نہ کہ حمید۔ یہ قانون وراثت کا ابتدائی قاعدہ ہے۔ اب دیکھئے کہ مودودی صاحب کی دلیل کی رُو سے بات کیا بنی؟

(ا) رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پا سکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے

(ب) حمید اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پا سکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ عمر موجود ہے۔

اب اور آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کی دلیل کو پھر دہرا لیجئے کہ رشید اپنے باپ (بکر) کے واسطے ہی سے زید کے مال کا حق دار ہو سکتا ہے اور چونکہ رشید اور زید کے درمیان واسطہ بکر نہیں رہا اس لئے رشید زید کے مال کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن مودودی صاحب کو شاید اس کا علم نہیں کہ اگر زید کی زندگی میں رشید فوت ہو جائے تو زید اس کے مال کا حق دار ہو جاتا ہے

اور یہ بھی کہ اگر زید کی زندگی میں عمر بھی فوت ہو جائے تو زید کی موت پر رشید اور حمید دونوں اس کے مال کے حق دار ہو جاتے ہیں۔

کیا مودودی صاحب بتائیں گے کہ:-

(i) رشید اور زید کے درمیان کون سا واسطہ تھا جس کی رو سے زید رشید کے مال میں حقدار ہو گیا؟ اور

(ii) زید کی زندگی میں بکر اور عمر کے مرجانے کی صورت میں وہ کون سا واسطہ تھا جس کی رو سے رشید اور حمید دونوں یتیم پوتے زید کے مال کے وارث قرار پا گئے۔

یہ تھی مودودی صاحب کی دلیل!

بہو کی مثال

مودودی صاحب نے یتیم پوتے کے ساتھ بہو کی مثال پیش کر کے خواہ مخواہ معاملہ کو اُلجھانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کی رو سے رشتہ داروں کی دو قسمیں ہیں (اور یہ تقسیم ایسی کھلی ہے کہ ہر شخص اسے تسلیم کرے گا)۔ ایک نسبی رشتہ دار یعنی وہ جو اشتراکِ نسب کی بنا پر رشتہ دار ہوں۔ مثلاً باپ، دادا، پردادا وغیرہ۔ اور نیچے کی طرف بیٹا۔ پوتا۔ پرپوتا وغیرہ یا بھائی بہن۔

دوسری قسم عقدی رشتے کی ہے جس میں میاں بیوی شامل ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ صرف نکاح کے عہد و پیمان سے ہوتا ہے۔ اشتراکِ نسب کی بنیاد پر نہیں ہوتا اس لئے میاں بیوی کا وارث ہوتا ہے اور بیوی میاں کی۔ بکر کی بیوہ زید سے نہ تو نسبی رشتے میں ہے نہ اس کے عقد میں آئی ہے پھر وہ زید کے مال میں کس طرح وارث ہو سکتی ہے وہ اپنے شوہر کے مرنے پر اس کے ترکہ سے وراثت پا سکتی ہے۔ زید سے اس کا وراثتی تعلق ہی نہیں۔ نسب کا رشتہ مستقل رشتہ

ہوتا ہے لیکن عہدی رشتہ صرف عہد و پیمان تک رہتا ہے۔ بیٹا بیٹا ہی رہتا ہے خواہ اس کا باپ زندہ ہو، یا مر چکا ہو۔ لیکن اگر بیوی سے عہدِ نکاح توڑ دیا جائے (یعنی طلاق دے دی جائے) تو اس سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ دادا اور پوتا نسبتی رشتہ دار ہیں۔ بکر زندہ ہے تو، مر گیا ہے تو، رشید بہر حال زید کا پوتا ہے۔ بہو اور خسر کا یہ رشتہ نہیں ہوتا اس لئے بہو اور خسر کی مثال سے دادا اور پوتے پر دلیل لانا یکسر غلط ہے۔ یتیم پوتا (رشید) اپنے دادا کی وراثت سے اس لئے حصہ پاتا ہے کہ وہ زید (اپنے دادا کا "ولد" ہے۔ یعنی وہ بکر (مرحوم) کا بیٹا ہونے کی جہت سے بکر کا حصہ نہیں لے رہا۔ زید کا "ولد" (پوتا) ہونے کے جہت سے براہ راست حصہ لے رہا ہے۔ اس فرق کو سمجھ لینے سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔

گالیاں اس کے جواب میں جو کچھ مودودی صاحب نے ——— ارشاد فرمایا تھا اسے بھی ملاحظہ فرمایئے۔

> میں نے پوتے کی وراثت کے معاملے میں تمام دلائل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ صرف اختصار کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ اس مسئلہ میں جذبات کی بنا پر فیصلہ کرنے کی بجائے اگر معقول اصولوں کی بنا پر غور کیا جائے تو جو کچھ فقہائے بالاجماع لائے قائم کی ہے وہی سراسر معقول معلوم ہوتی ہے میرے بیان کردہ دلائل پر مزید بہت سے دلائل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ جو بات اس معاملہ میں سب سے زیادہ وزنی ہے وہ یہ ہے کہ سلف سے لے کر خلف تک تمام امت کے اہلِ علم اس پر متفق رہے ہیں۔ ایسے متفق علیہ مسائل کا متفق ہونا ہی بجائے خود اپنے اندر اتنا وزن رکھتا ہے کہ کوئی معقول آدمی اس سے اختلاف کی اس وقت تک جرأت نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے پاس دلائل کی کوئی بڑی غیر معمولی طاقت نہ ہو اور یہاں حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے اختلاف کی جرأت کی ہے ایک طرف تو ان کے دلائل ایسے قوی نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر امت کے ایک متفق علیہ مسئلے میں تغیر کیا جا سکے اور دوسری طرف وہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلے میں ہمیشہ ایک نرالی پچ کی بات نکالا کرتے ہیں ان کی بات اگر مانی جائے تو گویا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لے کر آج تک ساری امت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے اس طرح کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے؟

(سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ترجمان القرآن۔ بابت جون جولائی ۵۲ء)

دلیل کا جواب دلیل سے دیا جا سکتا ہے لیکن جب کوئی اس طرح گالیوں پر اتر آئے تو اس کا جواب کم از کم ہمارے

بس کی تو بات نہیں۔

خود فیصلہ کیجئے یہ ہے یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ۔ اور یہ ہے قرآن کریم کی رُو سے اس کی پوزیشن۔ اب آپ خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ کیا

(i) یہ قانون قرآن کے مطابق ہے کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے حصہ ملنا چاہیئے۔ یا

(ii) یہ قانون کہ یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔ ساری جائداد اس کے چچا کو مل جانی چاہیئے۔

۲- وصیّت

وراثت کے سلسلے میں ایک اور اہم شق ہے جس کے متعلق ہمارا مروجہ قانون، قرآن کریم کے صریحاً خلاف ہے اور فوری توجہ کا محتاج — وہ ہے وصیت۔ قرآن کریم میں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝

تم پر یہ فرض قرار دیا جاتا ہے کہ جب تم دیکھو کہ تمہاری موت قریب ہے اور تم اپنے پیچھے کچھ مال چھوڑ رہے ہو تو تم اپنے والدین اور دیگر اقربا کے لئے انصاف اور قاعدے کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ ایسا کرنا تمام متقین پر فریضۂ خداوندی ہے۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے وصیت کرنے کی کس قدر سخت تاکید کی ہے۔ آیت کی ابتداء "کتب علیکم" سے ہوتی ہے۔ یعنی تم پر فرض قرار دیا جاتا ہے اور آخر میں کہا جاتا ہے "حقاً علی المتقین" ایسا کرنا تمام متقین پر لازم ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ یہ وصیت والدین اور دیگر رشتہ داروں سب کے لئے ہوگی۔

وصیت کرنے کی تاکید سورۃ المائدہ میں وصیت کے سلسلے میں تفصیلی طور پر بتا دیا کہ اس کے لئے دو صاحب عدل گواہوں کی ضرورت ہوگی اور پھر اس کی بھی تاکید کر دی کہ گواہ سچی سچی شہادت دیں۔ (دیکھئے ۵:۱۰۶) اس سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے وصیت کو

کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ نیز سورۂ بقر میں ان گواہوں سے تاکید کی گئی ہے کہ وہ اس وصیت میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کریں۔ (دیکھئے ۲/۱۸۱) البتہ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۲/۱۸۲)

اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا بلکہ وہ کسی طرف بے جا طور پر جھک گیا ہے تو اسے چاہیئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کرے۔ ایسا کرنا کوئی جرم نہیں۔ اس سے وہ لوگ جن کے ساتھ انصاف نہیں ہوا تھا حق تلفی سے محفوظ ہو جائینگے۔ یہی مرحمتِ خداوندی کا تقاضا ہے۔

آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ جس وصیت میں انصاف کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو اس کے خلاف عدالت میں اپیل ہو سکتی ہے۔

مزید وضاحت ۴۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے مختلف وارثوں کے حصے مقرر کئے ہیں۔ ان حصوں کا حکم اس طرح ہے کہ۔

لڑکے کو اتنا ملے گا۔ لڑکی کو اتنا۔ باپ کو اتنا۔ ماں کو اتنا۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ قرضہ کی ادائیگی کے بعد۔ اور اس وصیت کے بعد جو مرنے والے نے کی ہو۔

اس کے بعد پھر بعض وارثوں کے حصوں کا ذکر ہے یعنی

بیوی کو اتنا ملے گا۔ خاوند کو اتنا۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (۴/۱۲) قرضہ کی ادائیگی اور اس وصیت کے بعد جو انھوں نے کی ہو۔

اس کے بعد مزید احکام ہیں کہ

یہ شکل ہو تو اتنا اور یہ ہو تو اتنا۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ قرضہ کی ادائیگی یا اس وصیت کے بعد جو تم نے کی ہو۔

اس کے بعد پھر مزید احکام ہیں کہ

اگر مرد یا عورت کلالہ ہو تو اس کی وراثت یوں تقسیم ہوگی۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ (۴/۱۲)

یا اس وصیت کے بعد جو کی گئی ہو یا قرضہ کی ادائیگی کے بعد جو کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے نہ لیا گیا ہو۔

یہ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے۔

ان آیات میں مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ کے معنی بالکل واضح ہیں۔ یعنی اگر وصیت کل مال کو محیط نہ ہو۔ (COVER نہ کرتی ہو) یا اگر کسی کو وصیت کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا ہو تو پھر اس کے ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی اگر اس کی وصیت کل مال کو محیط ہوگی تو پھر ان حصوں کے مطابق ترکہ کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

اس کی مصلحت ظاہر ہے کہ ہر شخص کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور ان کی روشنی میں وہی ٹھیک فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کے مال میں سے کس کو کس قدر ملنا مناسب ہے۔ خدا نے انسانوں کا یہ اختیار سلب نہیں کیا بلکہ اسے فرض قرار دیا کہ ہر شخص اپنے اپنے حالات کے مطابق حق و انصاف کے ساتھ وصیت کر کے مرے ہاں البتہ اگر ایسا ہو کہ ایک شخص کی موت اچانک واقع ہو گئی ہے اور اسے وصیت کرنے کا وقت نہیں ملا یا اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد بھی کچھ بچ رہتا ہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اسے وارثین کی مرضی پر نہیں چھوڑ دیا کہ وہ جس طرح چاہیں ترکہ کی تقسیم کریں۔ اس طرح بے شمار جھگڑے پیدا ہو جاتے ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف وارثوں کے حصے خود مقرر کر دیئے۔

۴۔ آپ قرآن کریم کی ان آیات پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کیا ان میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی ہے؟ (الجھاؤ یا پیچیدگی تو قرآن کے کسی حکم میں بھی نہیں) نیز اس پر بھی غور کیجئے کہ اس باب میں قرآن نے کس قدر وضاحت سے کام لیا ہے اور وصیت کے متعلق کس قدر تاکیدی احکام دیئے ہیں جہاں وصیت کا حکم دیا ہے وہاں ایک بار نہیں بلکہ دو بار کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا کی طرف سے فرض قرار دیا گیا ہے اور جہاں ترکہ کے حصوں کا ذکر ہے وہاں دو آیتوں میں چار مرتبہ اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ وارثوں کے یہ حصے وصیت پوری ہونے کے بعد ہوں گے۔

ہمارا مروجہ قانون لیکن ہمارے ارباب شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مال کے ۱/۳ حصے سے زیادہ کے لئے وصیت نہیں کر سکتا اور یہ وصیت وارثوں کے لئے نہیں ہو سکتی۔ غور کیجئے۔ قرآن کریم نے بالفاظ صریح کہا ہے کہ وَصِيَّةٌ لِّلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (۲/۱۸۰) وصیت والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لئے کرنی ہوگی لیکن ان حضرات کا فیصلہ ہے کہ وصیت وارثوں (والدین یا دیگر رشتہ داروں) کے لئے نہیں ہو سکتی۔ پھر قرآن نے اس کل مال کے لئے وصیت کا حکم دیا ہے جسے کوئی شخص چھوڑ کر مرے (اِنْ تَرَكَ خَيْرًا) اس نے کہیں نہیں کہا کہ وصیت اتنے حصے تک ہو سکتی ہے اس سے زیادہ کے لئے نہیں ہو سکتی لیکن ان حضرات کا ارشاد ہے کہ نہیں! یہ وصیت صرف ایک تہائی

مال میں ہوسکتی ہے۔ اسی کے مطابق ہمارا موجودہ قانون ہے۔ اس قانون کی زد سے جس قدر مشکلات پیدا ہو رہی ہیں اس کی مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص کے دو بیٹے ہیں اس نے اپنے بڑے بیٹے کو پڑھایا لکھایا۔ بیرسٹر بنایا وہ اب برامرفہ الحال ہے دوسرا بیٹا حال ہی میں پیدا ہوا ہے اس کی پرورش۔ تعلیم و تربیت سب کچھ باقی ہے اس کے ان حالات اور انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ اس نومولود بیٹے کے لئے ایسی وصیت کر جائے جس سے اس کی تعلیم و تربیت بھی ایسی ہوسکے جیسی اس نے اپنے بڑے بیٹے کی کی تھی لیکن مروجہ قانون کی رُو سے یہ شخص اپنے اس بیٹے کے لئے کوئی وصیت نہیں کرسکتا اس کے مرنے پر اس کی جائداد دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم ہو جائے گی۔ یہ تو ہم نے صرف ایک مثال پیش کی ہے اس قسم کے مختلف واقعات ہر روز سامنے آتے رہتے ہیں جس میں اس قانون کی بدولت سینکڑوں مستحق محتاج رہ جاتے ہیں اور جائداد ان کے پاس چلی جاتی ہے جنہیں مرنے والا حق و انصاف کے مطابق ایک پائی بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ محتاج بے چارے واویلا مچاتے ہیں لیکن ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ قانون کے سامنے کسی کی کیا چل سکتی ہے۔

۵۔ کہا یہ جاتا ہے کہ شریعت کا یہ قانون ایک روایت پر مبنی ہے جسے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس میں لکھا ہے کہ وصیت صرف ⅓ مال ہی کی جاسکتی ہے اور وہ بھی وارثوں کے لئے نہیں کی جاسکتی۔ اس سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔

روایات کی پوزیشن

اگر رسول اللہ خود تشریف فرما ہوں اور کسی بات کا حکم دیں تو اس حکم کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہوگی اور (اس کی عدم اطاعت تو ایک طرف) اگر اس کے خلاف کسی کے دل میں گرانی تک محسوس ہو تو اس کے ایمان میں فرق سمجھا جائے گا لیکن سوال یہ ہے کہ اب جب کہ حضورؐ ہم میں موجود نہیں ان روایات کی جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے ایسا فرمایا تھا کیا پوزیشن ہے؟ انہیں بھی اسی طرح ارشادات رسول اللہؐ سمجھا جائے گا جس طرح اس حکم سمجھا جاتا تھا جسے حضورؐ نے بالمشافہ ارشاد فرمایا تھا؟

ان روایات کی پوزیشن یہ ہے کہ انہیں نہ نبی اکرمؐ نے خود مرتب فرمایا نہ صحابہ کبارؓ کو لکھوا کر دیا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ یا دیگر صحابہؓ نے انہیں مرتب، مدون، اور جمع کیا۔ رسول اللہؐ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد انہیں زبانی روایات کے طور پر مرتب کیا گیا۔ یہی وہ بنیادی چیز ہے جس سے رسول اللہؐ کے حکم اور ان روایات میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے الفاظ میں۔

> نبی صلعم کے قول و فعل کو میں بھی قرآن کی طرح حجت مانتا ہوں اور میرے نزدیک جو عقیدہ حضورؐ نے بیان کیا یا جو حکم حضورؐ نے ارشاد فرمایا وہ اس طرح ایمان و اطاعت کا مستحق ہے جس طرح کوئی ایسا عقیدہ یا حکم جو قرآن میں آیا ہو لیکن قول رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو اسناد کے لحاظ سے آیات قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ آیات قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول کو

لہ اس سے مگر اس کے ارشاد رسولؐ ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہوگا۔

نبی صلعم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں (رسائل ومسائل ص۲۷۰)
احادیث کے مجموعہ بخاری کے متعلق عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ اس میں سب احادیث صحیح ہیں لیکن مودودی صاحب اس کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ۔

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے — (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

اس لئے کہ

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ صحت ہے نہ کہ علم یقینی، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو انہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دئے گئے ہوں۔ (رسائل ومسائل ص۱۰۵)

زیر نظر سوال میں دیکھئے کہ وصیت سے متعلق احکام اللہ نے اپنی کتاب میں کس وضاحت سے بیان فرمائے ہیں ان کے برعکس ایک روایت ہے جو ان احکام کے بالکل خلاف جاتی ہے۔ ان حالات میں کیا سمجھنا چاہیئے؟ یہی کہ وہ روایت نبی اکرمؐ کا قول نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ نبی اکرمؐ نے ایسا حکم دیا ہوگا جو (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف تھا۔

لیکن ہمارے ارباب شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ ایسی صورت میں (جب کہ ایک روایت قرآن کے کسی حکم کے خلاف جاتی ہو) روایت کو صحیح مانو اور قرآن کے حکم کو منسوخ سمجھو۔ چنانچہ "علامہ مولوی حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی" اپنے رسالہ "فتنۂ انکار حدیث" میں لکھتے ہیں:۔

حدیث قرآن کی ناسخ ہے

نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے۔ جس طرح کہ قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری

> عقل کے مطابق ہو تو حجت نہ ہو۔ اسی طرح نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو (صفحہ ۴۸)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> رہی یہ بات کہ قولِ رسولؐ قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ ... (۲) تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آجائے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ ۔ وارث کے لئے وصیت نہیں اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا (۵۹)

یعنی یہ حدیث قرآن کے خلاف ضرور ہے لیکن عمل اسی کے مطابق ہوگا کیونکہ اس نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ مودودی صاحب جو احادیث کے متعلق وہ عقیدہ رکھتے ہیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے وہ بھی اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اس حدیث کو صحیح مانا جائے اور قرآن کریم کی آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ اور جو ایسا نہ مانے وہ منکرِ حدیث ہے۔

یہ ہے وہ عقیدہ جس کی رو سے وصیت صرف ⅓ مال میں کی جاسکتی ہے اور وہ بھی ان کے لئے جو وارث نہ ہوں۔

بہر حال یہ ہیں وصیت کے متعلق قرآن کریم کے احکام اور وہ ہے اس سلسلے میں ہمارا مروجہ قانون جو قرآنی احکام کے صریحاً خلاف ہے۔ چونکہ آئینی طور پر پاکستان میں کوئی قانون ایسا نہیں نافذ ہو سکتا جو اسلام کے خلاف ہو۔ اس لئے ہم حکومت سے استدعا کریں گے کہ وہ وصیت سے متعلق مروجہ قانون کو اسلام کے مطابق بنانے کے لئے مناسب اقدام کرے۔

حقائق وعبر

۱۔ اب اعتراض کیوں؟

جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ (منعقدہ اگست ۱۹۶۲ء) نے ایک ریزولیشن میں کہا ہے کہ پاکستان کی تمام دولت سمٹ کر قریب دو سو خاندانوں میں آگئی ہے اور یہ بہت بڑا ہے اسے روکنا چاہیئے۔

سوال یہ ہے کہ چند افراد یا چند خاندانوں کے پاس دولت کی اس قدر افراط جماعتِ اسلامی کے نزدیک مذموم کیوں ہے جب کہ ان کے امیر یہ فتویٰ صادر فرما چکے ہیں کہ۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق وواجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد ونہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ۔ پیسہ۔ جانور۔ استعمالی اشیاء۔ مکانات۔ سواری۔ غرض کسی چیز کے معاملے میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ (مسئلہ ملکیت زمین۔ ص ۵۲)

اسی بنا پر انہوں نے آگے چل کر لکھا ہے کہ زمین کی ملکیت پر بھی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ نیز

> ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے..... کلیاتِ شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدلِ اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ اسلامی تصور (ایضاً ص [illegible])

نیز یہ کہ جس طرح خدا ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی سامان، اتنا

صنعتی کاروبار۔ اتنے مویشی۔ اتنی موٹریں۔ اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو' اسی طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ (ص۴۳)

سوال یہ ہے کہ جب مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق کوئی حکومت اس قسم کی پابندی نہیں لگا سکتی کہ ایک فرد یا ایک خاندان کے پاس اتنی دولت، اتنی زمین یا اتنے کارخانوں سے زیادہ نہیں ہو سکتے کیونکہ ایسی حدبندی اسلام کے خلاف ہے تو پھر اس پر اعتراض کیسے کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے دو صد خاندانوں کے پاس اس قدر زیادہ دولت جمع ہو گئی ہے۔ دولت کے اس طرح چند خاندانوں کے پاس جمع ہو جانے کی وجہ ہی یہ ہے کہ (مودودی صاحب کے فتویٰ کے مطابق) ذرائع پیداوار — زمین اور کارخانوں وغیرہ — کو قومی ملکیت بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ذاتی ملکیت میں ان کی کوئی حد مقرر کی جا سکتی ہے۔ جب ذرائع پیداوار کا "بے حد و نہایت" ذاتی ملکیت میں رکھا جانا عین اسلام ہے تو اس کا لازمی نتیجہ — یعنی ان لوگوں کے پاس جن کی ملکیت میں یہ ذرائع پیداوار ہوں' بکثرت دولت کا جمع ہو جانا کس طرح خلاف اسلام قرار پا سکے گا۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہی مطالبہ کر سکتے ہیں کہ لوگ شرعی حقوق و واجبات (زکوٰۃ وغیرہ) ادا کرتے رہیں اس کے بعد آپ انبار در انبار دولت کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کر سکتے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جب دین کو کھلونا یا اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیا جائے تو پھر اس بے چارے کا حلیہ کس طرح بگڑتا ہے۔ جب زمینداروں اور کارخانہ داروں کو راضی رکھنے کی ضرورت پیش آئی' تو یہ فتویٰ دے دیا کہ ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت پر کوئی حدبندی نہیں لگائی جا سکتی' نہ ہی دولت کی مقدار پر کوئی پابندی عائد کی جا سکتی ہے' اور جب عوام میں اپنے پروپیگنڈے کی ضرورت پیش آئی تو کہہ دیا کہ دیکھو! ملک کی ساری دولت یہ بڑے بڑے امیر سمیٹ کر لے گئے ہیں اور تم بالکل نادار رہ گئے ہو!

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر دولت کی یہ ناہموار تقسیم مناسب نہیں تو اس مسئلہ کا حل کیا ہے مودودی صاحب کے فتویٰ کے مطابق:-

(۱) عدل اجتماعی کی خاطر زمین اور دیگر ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت میں نہیں لایا جا سکتا۔

(۲) ایک فرد یا ایک خاندان کس قدر زمین اور کس قدر دیگر ذرائع پیداوار کا مالک ہو سکتا ہے اس کی بھی کوئی حدبندی نہیں کی جا سکتی ہے اور

(۳) ایک فرد یا ایک خاندان کس قدر دولت جمع کر سکتا ہے اس پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

اس کے بعد کیا ہمارے یہ "ماہرین معاشیات" بتائیں گے کہ اسلام اس مسئلہ کا حل کیا بتاتا ہے جس کی رو سے دولت چند افراد کے پاس جمع نہ ہونے پائے بلکہ ملک میں اس کی تقسیم ہموار ہو؟ یعنی ملک کا معاشی نظام بھی وہ ہو جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جسے مودودی صاحب عین مطابق اسلام قرار دیتے ہیں اور دولت چند افراد یا خاندانوں میں سمٹنے بھی نہ پائے۔

۲۔ صحابہؓ کی شان میں

جماعت اسلامی کے ترجمان ایشیا (لاہور) بابت ۲۱ جون ۶۲ء میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے لاہور کی ایک مجلس ذکر حسینؓ کو خطاب کرتے ہوئے ایک تقریر کی اس میں یہ نقطہ بھی زیر بحث آگیا کہ یہ کیوں تھا کہ یزید کے زمانہ میں جس قدر صحابہؓ کرام موجود تھے (جن کی تعداد قریب سو کے قریب بتائی جاتی ہے) ان سب نے یزید کی بیعت کر لی تھی اور صرف امام حسینؓ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے فرمایا:-

> بعض لوگ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے تو بیعت کر لی تھی۔ حضرت حسینؓ نے کیوں نہ کی اور وہ ان کو مطعون کرتے ہیں۔ حالانکہ جب کوئی مسلمان حکومت پوری طاقت سے قائم ہو تو اس کے خلاف اٹھنا ہما شما کا کام نہیں صرف وہ اٹھ سکتا ہے جو فیصلہ کر چکا ہو کہ وہ اٹھے گا خواہ کچھ ہو جائے۔ جو لوگ ایسی بات کہتے ہیں ان کو صحابہؓ کی طرف سے صفائی پیش کرنی چاہئے نہ کہ حضرت حسینؓ کو مطعون کرنا۔ اٹھنے والے سے صفائی پیش کرنے کا مطالبہ کرنے کا کیا موقعہ ہے۔ صحابہ کرامؓ کی پوزیشن صاف کی جا سکتی ہے ہر شخص کا یہ کام نہیں تھا۔ یہ حضرت حسینؓ ہی کا نمونہ تو ہے جو مسلمان حکومت کے بگاڑ کے وقت مسلمانوں کی راہنمائی کرتا ہے ... (یہ) نمونہ یہ ہے کہ مسلمان حکومت بگڑ رہی ہو تو مسلمان کا کام تماش بین بن کر بیٹھنا نہیں بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اصلاح کے لئے کھڑا ہو جائے خواہ اکیلا ہی ہو اور خواہ کچھ نتیجہ ہو۔

ہم نے اس اقتباس کے بعض الفاظ بیننے پر سمجھ کر نقل کئے ہیں اس لئے کہ ہمیں یہ جرأت کس طرح ہو سکتی ہے کہ ہم صحابہ کبارؓ کو (معاذ اللہ) "ہما شما" قرار دیں! اور انہیں نعوذ باللہ "تماش بین" ٹھہرائیں۔ یہ جرأت تو مودودی

صاحب ہی کو ہوسکتی ہے جن کے ناوک سے اور تو اور (خاکم بدہن) وہ ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ التحیۃ والسلام) بھی نہ بچ سکی جن کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی! قصہ مختصر

حضورؐ کے متعلق اس شخص نے (استغفر اللہ۔ استغفر اللہ) یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آپؐ جماعت کی تنظیم کے وقت مساوات انسانیہ کے جو اصول پیش فرمایا کرتے تھے جب تشکیلِ حکومت کا وقت آیا تو ان اصولوں کو (معاذ اللہ) بالائے طاق رکھ دیا۔ اور حکومت کو اپنے قبیلہ (قریش) کے لئے مخصوص کر لیا۔

یہ تو ہوئی (ایشیا میں شائع شدہ) مودودی صاحب کی تقریر۔ اب آگے بڑھیے۔ محمود احمد عباسی صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے۔ "خلافت معاویہ و یزید" اس میں انھوں نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ یزید کی خلافت اسلام کے خلاف نہیں تھی اس لئے صحابہ کبارؓ نے اس کی بیعت کرلی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب۔ امام دین نے ایشیا میں اس بحث کو چھیڑا اور عباسی صاحب کی مخالفت کی۔ اس کے جواب میں ایشیا کی ۱۹ راگست کی اشاعت میں ایک صاحب — حبیب المسلم — کے قلم سے گفت و شنید" کے کالم میں ایک شذرہ (یا ان کا مکتوب) شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

> یہ بات ہمارے حلق سے نیچے نہیں اتر سکتی کہ صحابہ کرامؓ جنہوں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے پرخچے اڑا دیئے جو کسی متکبر سے متکبر ہستی کو کبھی خاطر میں نہ لائے وہ اپنے ہی میں سے ایک فرد سے دب جائیں گے جس کے پاس بہر حال قیصر و کسریٰ جیسی طاقت نہ تھی۔ وہ لوگ جو بھری مسجد میں حضرت فاروق اعظمؓ کو ٹوک سکتے تھے وہ یزید کی غلطیوں پر خاموش کیسے رہ سکتے ہیں یا پھر نعوذ باللہ دولت کی چمک نے ان کو حق کی حمایت سے باز کیسے رکھا۔ کیا کوئی مسلمان یہ تصور بھی کر سکتا ہے۔ کیا محترم امام دین صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ خاک بدہن گستاخ 'بزدل یا لالچی تھے کہ انھوں نے حق کا ساتھ نہ دیا اور گھروں میں بیٹھے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں

> لیکن یار لوگوں نے تو چور دروازہ تلاش کیا ہوا ہے۔ یزید کو برا کہو۔ پھر یزید کو خلیفہ بنانے والوں اور بنوانے والوں کو برا کہو۔ پھر جب معاویہؓ۔ مغیرہ بن شعبہؓ اور عمرو بن العاصؓ کو برا کہا جائے گا تو بات ضرور ان تک پہنچے گی جنہوں نے ان لوگوں پر اعتماد کیا اور آگے بڑھایا۔ اس چور دروازے کو بند ہی ہونا چاہیئے اور عباسی صاحب کی کتاب اس لئے بہترین نقل ہے۔ بہت سوں نے اس کا جواب لکھا ہے۔

لیکن سوائے اسے گالیاں دینے اور کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے کے کچھ نہ کر سکے اس کے رد میں لکھی ہوئی کتابیں سب لچر دلائل پر مبنی ہیں۔

الیشیا نے پہلے اپنی جماعت کے امیر کی تقریر (بلا تبصرہ) شائع کی جس میں انھوں نے یہ کہا کہ یزید کی خلافت کے خلاف اٹھنا من عزم الامور تھا جس کی ہمت "ہاشما" کو نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت حسینؓ نے اپنے کردار سے مسلمانوں کے لئے نمونہ پیش کر دیا کہ ایسے وقت میں مسلمان کا شیوہ "تماش بین" بن کر بیٹھے رہنا نہیں۔

اس کے بعد الیشیا نے حبیب المسلم کا شذرہ (یا مکتوب) بلا تبصرہ شائع کر دیا جس میں صحابہ کبارؓ کے بلندیٔ مقام کو اُجاگر کیا گیا ہے اور عباسی صاحب کے نظریہ کی تائید کی گئی ہے۔

کیا ہم اپنے موقر ہمعصر سے گزارش کر سکتے ہیں کہ وہ اتنا واضح کر دیں کہ انھوں نے سیرتِ صحابہ کبارؓ کی جو دو متضاد تصویریں پیش کی ہیں، ان میں سے کون سی تصویر ان کی سیرت کی صحیح ترجمان ہے؟ وہ تصویر جسے مودودی صاحب نے پیش کیا ہے یا وہ جو مسلم صاحب کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔؟

قارئین تصحیح فرمالیں

طلوع اسلام کے جولائی کے شمارہ میں علم جغرافیہ اور قرآن پاک" کے عنوان سے ڈاکٹر مس مریم خاں صاحبہ کا جو مقالہ شائع ہوا تھا اس میں حسب ذیل تصحیح فرما لیجئے۔

۱۔ صفحہ ۴۴ پر علامہ اقبال کے درج شدہ اشعار کا پہلا مصرعہ یوں ہے۔

ع تو شب آفریدی۔ چراغ آفریدم

۲۔ صفحہ ۴۵ پر پانچویں سطر کی اصل عبارت یوں ہے۔

تو آج تقسیم ہندستان غیر طبعی طور پر نہ ہوتی۔

ادارہ

بَابُ المراسلات

کمیونزم اور اسلام

سوال۔ آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہمارے زمانے میں کمیونزم ایک دین کی حیثیت سے اسلام کے مدمقابل اٹھی ہے اور یہی اس وقت اسلام کی سب سے بڑی حریف ہے۔ اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

جواب۔ دین اس نظامِ زندگی کا نام ہے جو ایک مخصوص آئیڈیالوجی (نظریۂ حیات) کی بنیادوں پر متشکل ہو۔ اگر وہ آئیڈیالوجی حق ہے تو وہ دین بھی برحق ہوگا۔ اگر وہ بنیاد باطل ہے تو اس پر استوار نظام بھی باطل ہوگا۔ اسلام دینِ الحق ہے۔ کمیونزم دینِ باطل ہے۔

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں، لیکن ان کی حیثیت ایک نظامِ زندگی کی نہیں۔ مذہب کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ انسان کا ــ پرائیوٹ عقیدہ ہے۔ جس کا مقصد خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق پیدا کرنا ہے ــــــــ۔ اس کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب پرست لوگوں کے یہاں مملکت سیکولر بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً انگلستان کے باشندے، عیسائی ہیں، وہاں کے بادشاہ کے لئے بھی عیسائی ہونا ضروری ہے۔ لیکن ان کی مملکت سیکولر ہے۔ ان کا مذہب گرجے کی چار دیواری تک محدود ہے۔ اس سے باہر کی دنیا سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ یہی کیفیت ہندوستان کی ہے۔ وہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو مذہب کی پیرو ہے۔ لیکن مملکت آئینی طور پر سیکولر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت یا ہندومت (وغیرہ) کو ان کے اجتماعی نظامِ حیات سے کچھ تعلق نہیں۔ لہٰذا یہ دین نہیں مذاہب ہیں اور جب یہ دین نہیں تو ان کا دین (نظامِ زندگی) کی حیثیت سے اسلام کے مدمقابل آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام ان مذاہب کو بھی مبنی بر صداقت قرار نہیں دیتا، اس لئے کہ اپنی جگہ تعلیم کو یہ مذاہب تعلیم خداوندی

کہہ کر پیش کرتے ہیں، قرآن کا بیان ہے کہ وہ حقیقی تعلیم خداوندی نہیں۔ اس میں انسانی تصورات کی آمیزش ہو چکی ہے۔ حقیقی تعلیم خداوندی اب صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس لئے اگر یہ اصل مذاہب چاہتے ہیں کہ تعلیم خداوندی کا اتباع کریں تو ان کے لئے قرآن پر ایمان لانا اور اس کا اتباع ضروری ہے۔ لیکن چونکہ یہ مذاہب اسلام کے مقابلہ میں ایک متوازی دین (نظام زندگی یا نظام مملکت) کی حیثیت سے کھڑے نہیں ہوئے اس لئے اسلامی مملکت، ان اصل مذاہب کو اپنی حدود کے اندر نہ صرف پُرامن زندگی بسر کرنے کی اجازت دیتی ہے، بلکہ انہیں مذہبی آزادی دیتی ہے اور ان کی پرستش گاہوں کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے۔

کمیونزم کی پوزیشن ان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ایک فلسفۂ حیات یا نظریۂ زندگی (آئیڈیالوجی) پیش کرتی ہے اور اس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک اجتماعی نظام متشکل کرتی ہے۔ اس اجتماعی نظام میں اس آئیڈیالوجی کو ایمان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کمیونزم کی آئیڈیالوجی پر ایمان نہ لائے لیکن اس کے معاشی نظام کو تسلیم کر لے، تو اسے کمیونسٹ تصور کر لیا جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ وہ کمیونسٹ برادری کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ کمیونزم اسے اپنے دائرہ میں داخل نہیں سمجھے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کی آئیڈیالوجی پر ایمان لا کر اس کے اجتماعی نظام کو صحیح تسلیم کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کمیونزم کی پوزیشن نہ تو ایک مذہب کی سی ہے جس میں آئیڈیالوجی (عقیدہ) کو اجتماعی نظام زندگی سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی وہ ایک سیکولر نظام مملکت ہے جو افراد مملکت کے مذہب (نظریۂ زندگی) سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی حیثیت بالکل "دین" کی سی ہے جس میں نہ آئیڈیالوجی نظام اجتماعی سے الگ ہوتی ہے اور نہ ہی نظام اجتماعی، آئیڈیالوجی سے جدا۔ اس میں "ایمان و عمل" کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔

۲۔ اب آیئے آئیڈیالوجی کی طرف۔ اسلام کی آئیڈیالوجی کے اہم عناصر یہ ہیں کہ

(۱) انسان صرف اپنے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اس میں طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے قرآن "روح خداوندی" کہہ کر پکارتا ہے۔ اور جسے بغرض تعارف، انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم کی مشینری طبیعی قوانین کے تابع چلتی رہتی ہے اور جب یہ مشینری چلنے سے بند ہو جاتی ہے تو انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی ذات، نہ تو طبیعی قوانین کے تابع ہے اور نہ ہی جسم کی موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی، اس کی طبیعی موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ اسے "اخروی زندگی" کہا جاتا ہے۔

(۲) جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعین ہیں۔ یہ قوانین خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں۔ وحی حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے

دوسرے انسانوں تک پہنچتی تھی۔ اب یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کے اندر محفوظ ہے۔

(۳) وحی کی رو سے عطا شدہ قوانین کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ دین نام ہے اس نظام حیات کا جو ان مستقل اقدار کی حدود کے اندر گھرا ہو۔ وہ نظام ان حدود کا پابند بھی ہوتا ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ ان سے تجاوز کرنا تو ایک طرف، وہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل بھی نہیں کر سکتا۔

(۴) انسان کے ہر عمل، حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس کو اعمال کا نتیجہ کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر انسان اپنے اعمال کے نتائج سے کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ خواہ وہ اس دنیا میں سامنے آجائیں یا حیات اُخروی میں۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔ جو عمل وحی کی مقرر کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہوگا اس کا نتیجہ خوش گوار ہوگا۔ جو ان کے خلاف ہوگا وہ انسان کے لئے مضرت رساں ہوگا۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ آئیڈیالوجی جس پر دینِ اسلام (یعنی اسلامی نظام اجتماعیہ) کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

کمیونزم کی آئیڈیالوجی اس کی بالکل ضد اور نقیض ہے۔ اس کی رو سے۔

(۱) انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۲) خدا۔ وحی۔ رسالت۔ مستقل اقدار۔ حیاتِ آخرت وغیرہ عقائد سب فریب ہیں۔

(۳) چونکہ انسان نام ہے اس کی طبیعی زندگی کا، اس لئے انسان کے سامنے مسئلہ صرف روٹی کا ہے۔ اس سے آگے کوئی مقصدِ حیات نہیں۔ جس طریق اور جس ذریعہ سے یہ مقصد حاصل ہو جائے، وہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ جو اس کی راہ میں حائل ہو وہ ناجائز اور مذموم۔ مارکس کے الفاظ میں

> اخلاقیات۔ مذہب۔ مابعد الطبیعیات اور دیگر تمام تصورات سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔

اس لئے لینن نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ

> ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی ما فوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں .... اشتراکین کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت کا بقا اور اسکے کام کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب۔ دروغ بافی۔ فریب دہی عین حق و صداقت ہے۔

یہ ہے وہ آئیڈیالوجی جس پر کمیونزم اپنے اجتماعی نظام کی عمارت استوار کرتی ہے۔ لہٰذا "دین اشتراکیت" "دین اسلام" کی ضد اور اس کا حریف ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا ہے کہ :-

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس ۔۔۔ بر مساواتِ شکم دارد اساس

اقبال نے مارکس کو پیغمبر (لیکن پیغمبر حق ناشناس) اور اشتراکیت کو "دین" سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ یوں ہی شاعری نہیں کی۔ اس کی اسی نظم کا پہلا شعر ہے۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل ۔۔۔ یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

یعنی کتاب۔ سرمایہ (THE CAPITAL) کا یہودی مصنف، کارل مارکس "پیغمبرِ بے جبرئیل" تھا۔ ایسے دین باطل کا موجد جس کی بنیاد وحی خداوندی پر نہیں تھی۔ باطل پر تھی۔

میرا خیال ہے کہ ان تصریحات سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ جب میں نے کہا تھا کہ ہمارے زمانے میں کمیونزم ایک دین کی حیثیت سے اسلام کے مقابلہ میں اٹھی ہے تو اس کا مطلب کیا تھا۔ اور میرے اس فقرہ کا مفہوم کیا ہے جسے میں اکثر دہرایا کرتا ہوں کہ

نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ۔

کمیونسٹ ایک ایسے "دین" کا قائل ہے جو اسلام کی ضد ہے۔ اس لئے اس دین کا ماننے والا مسلمان کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کا پیرو، کمیونسٹ کیسے ہو سکتا ہے؟

لیکن کمیونزم اور اسلام کے اس قدر کھلے ہوئے تضاد کے باوجود لوگ بالعموم ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسلام، نظام سرمایہ داری کا دشمن ہے اور کمیونزم کا معاشی نظام بھی سرمایہ داری کے نظام کا حریف ہے۔ اس سے سطح بین لوگ کہنے لگ جاتے ہیں کہ اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہیں۔ یہ وہ نہایت "لطیف فریب" ہے۔ جس کی طرف اقبال نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است

کارل مارکس کے "باطل" میں "حق" پوشیدہ ہے۔ یعنی اس کا دین (نظامِ حیات) تو باطل ہے، لیکن اس باطل میں ایک عنصر ایسا بھی ہے جو حق ہے ــــ یعنی نظام سرمایہ داری کی مخالفت ــــ اس لئے لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی وضاحت کے لئے حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ "بالشویت + خدا = اسلام" یعنی کمیونزم کے معاشی نظام کو اگر وحی خداوندی (قرآن کی اقدار) کے تابع رکھ دیا جائے تو وہ اسلامی نظام ہو جاتا ہے۔ جس طرح، اگر سیاست میں جمہوری نظام (شورائیت) کو وحی خداوندی (قرآنی اقدار)

کی حدود کے اندر رکھ لیا جائے تو وہ اسلامی نظام ہو جاتا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں ایک اور قسم کا دھوکا عام ہو رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ جوں ہی کسی نے اسلام کے معاشی نظام کا نام لیا، مخالفین نے جھٹ سے اس پر کمیونسٹ کا لیبل لگا دیا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جس طرح آپ ایک کمیونسٹ (یعنی وحیٔ خداوندی سے انکار کرنے والے) کو مسلمان نہیں کہہ سکتے، اسی طرح آپ ایک مسلمان (وحیٔ خداوندی پر ایمان رکھنے والے) کو کمیونسٹ نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کمیونزم اور اسلام کے اس بنیادی فرق کو اس مقام پر مختصر الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اگر آپ اس کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہوں تو میری کتاب "سلیم کے نام" خطوط (جلد اول) میں آٹھویں اور نویں خط کا مطالعہ کیجئے۔ میری تصنیف "نظام ربوبیت" اور "انسان نے کیا سوچا" میں معاشیات سے متعلق باب بھی اس موضوع پر کافی معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔

یہاں تک میں نے ان ہر دو نظام ہائے حیات ——— سوشلزم اور اسلام --- کے اصولوں سے بحث کی ہے۔ لیکن ان کا حقیقی فرق وہاں جا کر واضح ہوتا ہے جہاں ان کا مقصود و منتہیٰ سامنے آتا ہے۔ جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، دونوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں لیکن کمیونزم، ایک فرد کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) یا اس کی ذات کو کچل کر اسے روٹی دیتی ہے۔ اور اسلام اسے اس لئے روٹی کی فکر سے آزاد کرتا ہے کہ وہ اپنی ذات یا انفرادیت کی نشو و نما اطمینان سے کر سکے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

آں خدا نانے دہد، جانے دہد　　ایں خدا نانے دہد، جانے برد

روٹی کے مسئلہ کو منتہیٰ و مقصود قرار دے لینا حیوانی سطح زندگی ہے۔ انسان کی زندگی کا منتہیٰ و مقصود انسانی ذات کی نشو و نما ہے۔ یعنی جو چیز اشتراکیت میں مقصود بالذات ہے، وہ اسلام میں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ بلند مقصد ان مستقل اقدار کے اتباع کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا جو وحی کی رو سے ملی ہیں۔ لہٰذا مقصود و منتہیٰ کے اعتبار سے بھی دیکھئے تو کمیونزم کا نظامِ حیات، اسلام کی یکسر نقیض ہے۔

والسلام۔

پرویز

تواتر

سوال۔ میں آپ کے درس میں اکثر شریک ہوتا ہوں۔ آپ جو باتیں بیان کرتے ہیں ان کے ساتھ قرآن کریم کی سند ہوتی ہے۔ ویسے بھی وہ جی کو لگتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کئی باتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اسلاف سے متواتر چلا آرہا ہے، وہ اس کے خلاف ہیں۔ تواتر کے متعلق علمی بحث زیادہ تر ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا آپ کسی مثال سے بات سمجھا دینگے۔!

جواب۔ سب سے پہلے اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے چلا آتا ہے، وہ سب کا سب غلط ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ ہمارے ہاں پیچھے سے چلا آرہا ہے اسے محض اس لئے صحیح تسلیم نہیں کر لینا چاہیئے کہ وہ پیچھے سے چلا آرہا ہے۔ اس میں سہو اور غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسے پرکھ لینا چاہیئے۔ جو کچھ اس میں صحیح ہو اسے قبول کر لینا چاہیئے۔ جو غلط ہو اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک دینی امور کا تعلق ہے، ان کے پرکھنے کی کسوٹی، قرآن کریم سے زیادہ قابل اعتماد اور کون سی ہو سکتی ہے۔؟

اب اس کی مثال دیکھئے۔ ہمارے ہاں شروع سے یہ بات بطور مسلمہ چلی آرہی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ سال کی، اور رخصتی کے وقت نو سال کی تھی۔ مجھے اس بات کے صحیح تسلیم کرنے میں ہمیشہ تردد رہا کیونکہ قرآن کریم نے نکاح کے لئے بالغ ہونا ضروری قرار دیا ہے، اور اس بات کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا کہ نبی اکرمؐ کا کوئی عمل (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس باب میں تحقیق کی، اور خود ہماری کتب تاریخ و سیر سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر انیس برس یا کم از کم سترہ برس کی تھی[1] ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر کا واقعہ، ایک محسوس اور بدیہی بات ہے جس کے شاہد سینکڑوں ہزاروں لوگ ہوں گے لیکن اس کے باوجود ہماری کتب روایات و سیر میں ان کی عمر صحیح درج نہ ہو سکی۔ اور اس کے بعد آج تک اسی غلط عمر کو صحیح تسلیم کیا جاتا رہا۔ جب اس قسم کے محسوس اور بدیہی واقعات میں ایسی غلطی ہو سکتی ہے تو غیر محسوس اور غیر مرئی امور میں ایسی غلطیوں کا امکان اور بھی زیادہ ہے اگر یہ بائیں عام تاریخ سے متعلق ہوں تو ان میں سہو یا خطا، ہمارے ایمان یا اسلام پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

---

[1] میرا یہ مقالہ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا اور اب "طاہرہ کے نام خطوط" (جلد دوم) میں بھی شامل ہو چکا ہے۔

لیکن جو امور دین سے متعلق ہوں یا ان کا تعلق نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی زندگی سے ہو اس میں اس قسم کے سہو یا خطا کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں۔ اس لئے ان امور میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس احتیاط کا تقاضا ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے سامنے یہ اصول رکھیں کہ جو کچھ ہمارے پاس اسلاف سے چلا آ رہا ہے اسے پرکھا جائے اور اگر اس میں کوئی ایسی بات ہو جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہے یا اس سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ یا صحابہ کبارؓ کے خلاف کوئی طعن پڑتا ہے تو اس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ وہ ہم تک صحیح طور پر نہیں پہنچی۔ ایسا کہہ دینے سے اسلاف کے احترام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لئے کہ وہ بھی بالآخر انسان تھے۔ اور انسان سے سہو یا خطا کا امکان ہے۔ انہوں نے دین کی جو خدمات سرانجام دیں وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ انہیں معصوم اور منزہ عن الخطا مانا جائے۔ یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی جب اسے سمجھ لیا جائے کہ جو حضرات اس وقت ہمارے سامنے موجود نہیں وہی آنے والوں کے لئے اسلاف ہو جائیں گے۔ سو جب ہم اپنے سامنے کے حضرات کو ان کی زندگی میں سہو و خطا سے منزہ نہیں مانتے تو یہی حضرات اپنی وفات کے بعد منزہ عن الخطا کیسے ہو سکتے ہیں (پرویز)

۳۔ قرآنی نصب العین

سوال۔ دوسری دریافت طلب بات یہ ہے کہ آپ اپنے درس میں جس اسلام کا نقشہ پیش کرتے ہیں اس کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں۔ اس کے ساتھ قرآن شریف کی سند ہوتی ہے لیکن اس اسلام کا معیار اتنا بلند ہے کہ کم از کم ہم موجودہ مسلمان اس تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس صورت میں اس صحیح اسلام کو عمل میں لانے کی شکل کیا ہوگی۔؟

جواب۔ ایک چیز ہوتی ہے نصب العین اور دوسری چیز ہوتی ہے اس نصب العین تک پہنچنے کا طریق۔ قرآن کریم جس اسلام کا نقشہ پیش کرتا ہے وہ اسلامی معاشرہ کا نصب العین ہے۔ وہ مسلمانوں (بلکہ یوں کہئے کہ نوع انسان) کی اس دنیا میں منزل مقصود ہے۔ اسلام کے قرن اول میں ہوا یہ کہ جوں جوں قرآن نازل ہوتا گیا، نبی اکرمؐ ساتھ کے ساتھ اپنی جماعت کی تعلیم و تربیت فرماتے گئے۔ حتیٰ کہ جب تکمیل دین کا اعلان ہوا تو یہ جماعت بھی اس کے پیش کردہ نصب العین تک پہنچ گئی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ قرآن اپنی مکمل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے لیکن مسلمانوں کی زندگی اس کے مطابق نہیں۔ اس لئے جب ہم قرآن میں پیش کردہ اسلام کو سامنے لاتے ہیں تو ہماری زندگی اس میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ اس لئے ہمیں یہ مقام اپنی حد وسعت سے دور معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے کہ یہ معیار محض مثالی (IDEAL) ہے۔

ممکن العمل نہیں۔ یہ غلط ہے۔ قرآن کا پیش کردہ اسلام ممکن العمل ہے۔ اس تک پہنچنے کا طریق یہ ہے کہ ہم اس اسلام کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھیں اور پھر بتدریج، قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھتے جائیں۔ اس کے لئے لائحہ عمل بھی وہی ہے جسے خود قرآن نے تجویز کیا اور نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی قوم کے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے (۱۲ اگست کے درس میں) سیرت نبی اکرمؐ پر تقریر کرتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت کی تھی کہ حضورؐ کی سیرت طیبہ ہمارے لئے (بلکہ پوری انسانیت کے لئے) اسوۂ حسنہ (بہترین ماڈل) ہے۔ دنیا کی مختلف مملکتوں کو بالعموم اور اسلامی ممالک کی حکومتوں کو بالخصوص اس ماڈل کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھنا چاہیئے اور پھر رفتہ رفتہ اس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس نصب العین کا سامنے رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ جب تک کسی نصب العین کو سامنے نہ رکھا جائے، یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ ہم صحیح راستے پر چل رہے ہیں یا نہیں۔ "ترقی" کے معنی ہی اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے جانا ہیں۔ اگر نصب العین سامنے نہ ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں یا تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔

جن حالات میں ہم اس وقت گھرے ہوئے ہیں ان سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ ہم قرآن کریم سے اسلام کا صحیح، واضح اور متعین نقشہ مرتب کریں۔ اور اس نقشے کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھیں اور پھر اس کا جائزہ لیتے جائیں کہ ہمارا قدم اس نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہے یا نہیں۔ اس وقت ہماری بنیادی دشواری یہ ہے کہ قوم کے سامنے اسلام کا واضح اور متعین تصور ہی نہیں۔ اسلام کے متعلق ہر گروہ بلکہ ہر فرد کا تصور جداگانہ ہے، اس لئے ہر ایک کا قدم مختلف سمتوں کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اس سے جو ملی انتشار پیدا ہو سکتا ہے اس کی زندہ شہادت ہماری موجودہ حالت ہے۔ جب تک اسلام کا متعین تصور سامنے نہیں رکھا جاتا نہ ہمارا انتشار ختم ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہمارا قدم صحیح منزل کی طرف اٹھ سکتا ہے۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق اسلام کے اس تصور کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں جسے قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ مجھے اس پر اصرار نہیں کہ میرے پیش کردہ تصور ہی کو صحیح تسلیم کیا جائے۔ میری دعوت یہ ہے کہ قوم کے ارباب فکر و نظر سر جوڑ کر بیٹھیں اور قرآن کریم سے اسلام کا واضح اور متعین تصور متشکل کر کے اسے قوم کے سامنے بطور نصب العین رکھیں اور پھر اس نصب العین کی طرف بڑھنے کے لئے عملی ذرائع اختیار کریں۔ قوم اس پر آمادہ ہونا نہیں چاہتی ـــ ماڈرن طبقہ اس لئے آمادہ نہیں ہونا چاہتا کہ اسلام کا متعین نصب العین سامنے آ جانے سے انہیں اپنی غیر اسلامی زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھالنا پڑے گا اور قدامت (مذہب) پرست طبقہ اس لئے اس کی مخالفت کرتا ہے کہ اسلام کے ایک متعین تصور سے ہر فرقہ کو اپنا اپنا "اسلام" چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ ہے اس مخالفت کی وجہ ـــ لیکن

ظاہر ہے کہ اس مخالفت سے اس مسئلہ کا حل نہیں مل سکتا۔ اگر ہمارا دعویٰ یہ ہے ـــــ اور یہ دعویٰ دیانتداری پر مبنی ہے ـــــ کہ ہم نے یہاں اسلامی معاشرہ متشکل کرنا ہے تو ہمیں اسلام کا ایک واضح اور متعین تصور مرتب کرکے اسے بطور نصب العین سامنے رکھنا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو موجودہ انتشار دن بدن بڑھتا جائے گا اور ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ (پرویز)

۴۔ ملحد و کافر کی جان بچانا

سوال۔ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ علمائے ازہر نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ کسی ملحد کی جان بچانے کے لئے اس کے جسم میں مسلمان کا خون منتقل کرنا شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح کسی مسلمان کے جسم کا کوئی حصہ کسی ملحد کے جسم میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ یہ فتویٰ قرآن کی رُو سے درست ہے۔؟

جواب۔ ہماری بصیرت کے مطابق یہ فتویٰ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم نے انسانی جان کو بڑا قیمتی قرار دیا ہے اور اسے بچانے کی بڑی تاکید کی ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کی طرف یہ تاکیدی حکم بھیج دیا تھا کہ یاد رکھو! جس شخص نے کسی دوسرے شخص کو قتل کر دیا ـــ بجز اس کے کہ وہ جرم قتل یا ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر ہو ـــ تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر دیا۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵/۳۲) اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوع انسان کو زندگی عطا کر دی۔

آپ غور فرمائیے کہ کیا اس سے بڑھ کر انسانی زندگی کی قیمت کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ خدا کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی ایک انسان کی بھی جان بچالی تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوع انسانی کو زندگی عطا کر دی۔ خدا نے اس میں مؤمن و کافر اور دیندار و ملحد کی جان میں کوئی تفریق نہیں کی۔ اس نے صرف "جان" یا "زندگی" کہا ہے وہ کسی انسان کی ہو۔ جو انسان کسی دوسرے انسان کی جان بچا لیتا ہے، قرآن کی رو سے وہ اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیتا ہے۔ ہمیں قرآن کریم میں کوئی حکم ایسا نہیں ملتا جس میں یہ کہا گیا ہو کہ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی جان بچانا تو فرض ہے، لیکن کسی غیر مسلم (کافر و ملحد) کی جان بچانا ناجائز ہے۔

قرآن نے جہاں جرم قتل کی سزا ـــ قصاص ـــ کا حکم دیا ہے وہاں بھی یہ نہیں کہا کہ اگر ایک مسلمان

دوسرے مسلمان کو قتل کرے تو اس کی سزا موت ہوگی۔ لیکن اگر کسی کافر ملحد کو قتل کر دے تو اس کی سزا کچھ نہیں ہوگی۔ قرآن کی رُو سے، مقتول مسلمان ہو یا غیر مسلم، دونوں کی جان کی قیمت یکساں ہے۔ اس لئے قاتل کو یکساں سزا ملے گی۔ جب قرآن کی رو سے مسلم اور کافر کی جان کی قیمت ایک جیسی ہے تو جان بچانے کے معاملہ میں ان دونوں میں کس طرح تفریق کی جا سکتی ہے۔

یہ تو پھر بھی انسان کی جان بچانے کا معاملہ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے ایک بدکار عورت کو اس لئے بخش دیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچا لی تھی۔ حیرت ہے کہ جس اسلام کی تعلیم یہ ہو اس کے علمبردار یہ فتویٰ دیں کہ اگر کسی مسلمان کا خون دینے سے، غیر مسلم کی جان بچتی ہو، تو اس کا خون دینا شرعاً ناجائز ہے۔ اس فتویٰ کی رو سے تو عجیب عجیب صورتیں پیدا ہوں گی۔ آپ کسی نہر کے کنارے پہنچتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ڈوب رہا ہے اور مدد کے لئے پکارتا ہے۔ اس فتویٰ کی رُو سے آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ پہلے اس کا اطمینان کر لیں کہ ڈوبنے والا کافر ملحد تو نہیں۔ اس لئے کہ اگر آپ نے اس کی جان بچالی اور وہ کافر ملحد نکلا تو آپ کا یہ فعل شرعاً ناجائز ہوگا۔ یا ایک شخص کسی حادثہ کا شکار ہو کر بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال پہنچتا ہے اور ڈاکٹر اسے خون دینے کی ضرورت سمجھتا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ اسے خون دے، اس کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ اگر بلڈ بینک (BLOOD BANK) میں مناسب خون کسی مسلمان کا ہے، تو یہ بے ہوش مریض کافر ملحد تو نہیں؟ اگر وہ کافر ملحد ہے تو اسے مسلمان کا خون نہیں دیا جا سکے گا۔

اس فتویٰ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ کسی مسلمان کی جان بچانے کے لئے کافر ملحد کا خون اس کے جسم میں منتقل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یا کسی مسلمان اندھے کے جسم میں کسی کافر یا ملحد کی آنکھ پیوست کر کے، اسے بینا، بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔؟

یاد رکھئے! خون یا جسم کا کوئی حصہ نہ مسلمان ہوتا ہے نہ کافر۔ نہ دیندار ہوتا ہے نہ ملحد۔ وہ صرف ایک انسان کا خون یا جسم کا حصہ ہوتا ہے۔ اگر کسی مسلمان کا خون، کسی کافر کے جسم میں منتقل کر دیا جائے یا اس کی آنکھ کسی ملحد کے جسم میں پیوست کر دی جائے، تو نہ وہ خون کافر ہو جائے گا نہ وہ آنکھ ملحد۔ ایک کافر جب خدا پر ایمان لے آتا ہے تو اس کا سارا جسم۔ خون۔ اعضا۔ سب وہی کے وہی رہتے ہیں لیکن وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ایک مسلمان ملحد ہو جاتا ہے تو اس کے جسم میں کسی قسم کا فرق نہیں آتا۔

آپ غور کیجئے! آج یورپ اور امریکہ کے دہریے، اپنی آنکھیں وقف کر دیتے ہیں کہ وہ پاکستان کے مسلمان

اندھوں کے جسم میں پیوست کردی جائیں تاکہ وہ دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔ وہ اپنا خون ہسپتالوں میں جمع کرا دیتے ہیں کہ اس سے بوقت ضرورت مندہ مریضوں کی جان بچائی جا سکے لیکن اسلام کے نام لیوا یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ مسلمان کا خون، کسی کافر وملحد کی جان بچانے کے لئے استعمال کرنا "از روئے شریعت" ناجائز ہے۔ اس اسلام کے نام لیوا جس نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس کا اعلان کیا تھا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ کفر و ایمان کا فرق انسانی مراتب کے لئے ہے۔ جہاں تک انسان کی جسمانی زندگی کا تعلق ہے اس میں سب انسان برابر ہیں۔

قابلِ توجہ خریدارانِ طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام میں بار بار شائع کردہ اعلانات اور یاد دہانیوں کے باوجود خریداروں نے ادارہ کی اہم معروضات پر توجہ نہیں فرمائی۔ اس صورت حال کا نتیجہ ادارہ کے لئے مالی خسارے اور پریشانیوں کا باعث ہے۔ غور فرمائی کی مخلصانہ امید کے ساتھ یہ گزارشات ایک بار پھر درج ذیل کی جاتی ہیں۔

(۱) طلوعِ اسلام کے موصولہ پرچے میں پہلا ورق الٹتے ہی، اگر آپ کو مطبوعہ کارڈ منسلک نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا چندہ ختم ہے۔ (۲) اس کارڈ کی حسب ضرورت خانہ پری کر کے اسے بلا تاخیر سپرد ڈاک کر دیجئے۔ اس کارڈ پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا ڈاک خرچ ادارہ برداشت کرے گا۔

(۳) اگر متعلقہ ماہ کی پندرہ تاریخ تک یہ کارڈ ادارہ میں واپس موصول نہ ہوا تو پرچہ بذریعہ وی پی ارسال کر دیا جائے گا۔ اور اس کا وصول کرنا اخلاقی فرض ہوگا۔ اس قسم کی وی پی کے پیکٹ میں طلوعِ اسلام کا کوئی پرانا پرچہ رکھ دیا جاتا ہے اس لئے آپ وی پی چھڑا کر اس سے پریشان نہ ہو جئے کہ یہ پرانا پرچہ کس طرح آگیا۔ یہ پرچہ کسی حساب شمار میں نہیں ہوتا (۴) تبدیلی پتہ کی ہر اطلاع ادارہ میں پندرہ تاریخ تک لازماً پہنچ جانی چاہیئے اس کے بعد موصول ہونے والی اطلاعات پر عملدرآمد ممکن نہیں ہوگا۔

شرک

[لاہور میں ہر اتوار کی صبح **پرویز** صاحب کا درسِ قرآن ہوتا ہے ــــ یعنی ہر ماہ کم از کم چار درس۔ قارئین کا پیہم اصرار رہتا ہے کہ ان درسوں کو طلوع اسلام میں شائع کیا جائے۔ ہر درس ڈیڑھ گھنٹہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اول تو اس درس کو لفظاً لفظاً ضبطِ تحریر میں لانا بہت مشکل ہے (کوئی اعلیٰ درجہ کا سٹینوگرافر ہی ایسا کر سکتا ہے) لیکن اگر ایسا کر بھی لیا جائے تو ان کی ضخامت اس قدر ہو جائے گی کہ طلوع اسلام کے محدود صفحات اس کے متحمل نہیں ہو سکیں گے اس لئے ہم اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ بعض اہم عنوانات کے درسوں کا خلاصہ مختصر الفاظ میں شائع کر دیا جائے۔

۲۴ / جون ۱۹۶۲ء کے درس کا عنوان تھا ــ **شرک** ــــ اس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے ــــــــــــــــــــــــــــــ طلوع اسلام]

شرک کو اللہ تعالیٰ نے جرم عظیم قرار دیا ہے ــ ایسا جرم "جس کی بخشش نہیں ہو سکتی" سوال یہ ہے کہ شرک کیا ہے اور وہ کیوں اس قدر سنگین جرم ہے۔ شرک کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ خدا کے سوا دوسروں کی پرستش کرنا شرک ہے اور

شرک کا عام تصور

اس کی محسوس اور بیّن مثال بُت پرستی ہے ــــ اور چونکہ مسلمان بتوں کو نہیں پوجتا اس لئے وہ مطمئن رہتا ہے کہ میں شرک کا مرتکب نہیں ہوتا۔ یہ تو ہوا شرک۔ اب رہی یہ بات کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ایسا سنگین جرم کیوں قرار دیا ہے تو اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ خدا بھلا اسے کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اوروں کی بھی پرستش کی جائے۔ یعنی اس سے چونکہ (معاذ اللہ) خدا کا کچھ بگڑتا ہے یا اس کی غیرت اسے گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی کو اس کا ہمسر بنا دیا جائے اس لئے وہ اس جرم کو کبھی نہیں بخشتا آپ غور کیجئے کہ

اس توجیہہ کی رُو سے خود خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک شرک پر ہی کیا موقوف ہے خدا کی عبادت۔ اس کے احکام کی فرماں برداری۔ حقوق اللہ کی ادائگی وغیرہ کے سلسلے میں جو عام عقیدہ ہمارے ہاں رائج ہے اس کی رُو سے خدا کے متعلق تصور ہی یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے کچھ اپنے مقاصد ہیں جنہیں وہ اس طرح ہم سے پورے کرانا چاہتا ہے۔ جب ہم قرآن کریم کی وہ آیت سنتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔ (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۔ ۵۱/۵۶) تو اس سے ہمارے اس عقیدہ کو اور پختگی حاصل ہو جاتی ہے کہ خدا کے سامنے کوئی اپنا پروگرام تھا جس کی تکمیل کے لئے اس نے ہمیں پیدا کر کے یہ فریضہ عائد کر دیا کہ ہم اس کی عبادت کرتے رہیں۔

خدا کے متعلق تصور خدا کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں وہ اپنے کسی پروگرام کی تکمیل کے لئے کسی کا محتاج نہیں (فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۳/۹۷) وہ جو احکام ہمیں دیتا ہے اس لئے نہیں کہ ان کی بجا آوری سے کچھ اس کا سنورتا ہے اور اگر ان کی تعمیل نہ کی جائے تو اس سے کچھ اس کا بگڑتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ ان احکام کی بجا آوری سے کچھ ہمارا ہی سنورتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے ہمارا ہی بگڑتا ہے اسی طرح خدا پر ایمان لانے سے بھی ہمارا ہی ایک عظیم مقصد حاصل ہوتا ہے اور اس سے انکار کرنے سے ہمارا ہی نقصان ہوتا ہے۔ خدا تو اس وقت بھی خدا تھا جب اسے کوئی ماننے والا نہیں تھا اور اگر آج بھی دنیا کے تمام انسان اس کی ہستی سے انکار کر دیں تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ (بلا تمثیل) سورج اس زمانے میں بھی اسی طرح روشنی دیتا تھا جب کوئی آنکھ اُسے دیکھنے والی نہیں تھی اور اگر آج ساری دنیا کے انسان اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں تو اس سے سورج کا قطعاً کوئی نقصان نہیں ہوگا خود انسانوں ہی کا نقصان ہوگا۔ لہٰذا خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننے سے بھی خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا نہ ہی اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنے سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ "ایک خدا" ماننے میں ہمارا ہی فائدہ ہے اور اس کے ساتھ اوروں کو شریک کرنے سے ہمارا ہی نقصان۔ اور یہ نقصان اتنا بڑا ہے کہ اس کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔۔۔ یہی مفہوم ہے اس ارشادِ خداوندی کا کہ شرک بخشا نہیں جا سکتا۔

شرک اور خوف شرک کے اس نقصانِ عظیم کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن قرآن نے اپنے مخصوص معجزانہ انداز سے اس تفصیل کو دو لفظوں میں بیان کر دیا جب کہا کہ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا (۳/۱۵۱) جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں ہم ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے ان پر خوف طاری ہو جائے گا اس لئے کہ وہ خدا کے ساتھ اسے شریک ٹھیراتے ہیں جس کی کوئی سند خدا نے نازل نہیں کی۔ بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ شرک سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں۔

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است ۔۔۔ خوف را در شرک مضمر دیدہ است

اس کے برعکس ایک خدا کو ماننے والے (مومنین) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۶۲) ان پر کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوتا۔ یعنی شرک سے خوف پیدا ہوتا ہے اور توحید کا لازمی نتیجہ بے خوفی ہے۔ اور یہ مومن اور مشرک کا بنیادی خطِ امتیاز ہے۔ آئیے ہم قرآن کریم سے اس اجمال کی تفصیل دیکھیں۔

مظاہر فطرت کی پرستش

جب ذہن انسانی عہدِ طفولیت میں تھا (اور اب بھی دنیا کی بیشتر آبادی کا یہی عالم ہے) تو وہ فطرت کی مختلف قوتوں کو دیوی دیوتا سمجھ کر ان کے حضور جھکتا اور گڑگڑاتا تھا۔ بجلی چمکی اور وہ سہم کر ہاتھ باندھنے لگ گیا۔ بادل گرجا اور وہ ڈر کر سجدے میں گر گیا۔ دریا کی طغیانیوں کو دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ چیچک یا طاعون جیسی وبائی بیماریاں پھوٹیں اور اس نے کسی ان دیکھی قوت کے سامنے ڈنڈوت بجالانا شروع کر دیا۔ غرضکہ ایک انسان تھا اور اسے اپنے چاروں طرف بلاؤں کا ہجوم نظر آتا تھا جن سے وہ ہر وقت ڈرتا۔ کانپتا رہتا تھا۔ خوف — ہر طرف سے خوف۔ ڈر، چاروں طرف سے ڈر، یہ تھی اس وقت انسان کی زندگی۔ اس سے بچنے کے لئے اسے اس کے سوا کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ وہ ان ان دیکھی قوتوں کو "خدا" سمجھ کر انہیں راضی رکھنے کی کوشش کرے۔ انہی ان دیکھی قوتوں کو اس نے محسوس شکلوں میں تراش کر بت پرستی شروع کر دی۔

انسان یہ کچھ کیوں کرتا تھا؟ اس لئے کہ وہ اپنے مقام سے آشنا نہیں تھا۔

قرآن کا پیغام

قرآن آیا اور اس نے انسان سے کہا کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے تاکہ انسان ان سے کام لے سکے۔ اس نے داستانِ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا کہ ملائکہ سب انسان کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ فطرت کی کوئی قوت ایسی نہیں جو انسان کے سامنے نہ جھک سکے۔ قرآن کی اس ایک انقلابی آواز نے ساجد کو مسجود اور مسجود کو ساجد بنا دیا۔ اس نے بتا دیا کہ جو انسان اپنے آپ کو فطرت کی ان قوتوں سے فروتر اور کمزور سمجھتا ہے وہ مقام آدمیت سے گرا ہوا ہے۔ انسان ان قوتوں (دیوی دیوتاؤں) کو اپنے سامنے جھکانے کے لئے آیا ہے ان کے سامنے جھکنے کے لئے نہیں آیا۔ جو ان کے سامنے جھکتا ہے اپنی تذلیل کرتا ہے جو انہیں اپنے سے بڑا مانتا ہے اپنے شرف اور فضیلت سے انکار کرتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھا کہ فطرت کی قوتوں کو خدا ماننے والا اور ان کے محسوس مظاہر (مٹی اور پتھر کی مورتیوں۔ بتوں) کے سامنے جھکنے والا خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔

۲۔ فطرت کی قوتوں سے آگے بڑھے تو بعض انسانوں نے دوسرے انسانوں کے سامنے جھکنا شروع کر دیا۔ یہ

انسانوں کی پرستش

کو ایشور کا اوتار۔ سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) بادشاہوں کو خدائی اختیارات کا حامل سمجھ کر ان کے حضور گڑگڑانا شروع کر دیا۔ انہیں ان داتا (رزق دینے والا) تصور کر کے ان سے ڈرنے اور کانپنے لگا۔ راجہ اور بادشاہ تو خیر پھر بھی محسوس قوتوں کے مالک تھے اس نے مذہبی پیشواؤں اور روحانی مقتداؤں۔ کو قضا و قدر کے احکامات کا مالک سمجھ کر ان کی پرستش شروع کر دی۔ وہ انہیں راضی رکھنے کے لئے ان کے آستانوں پر جبہ سائی کرنے لگا اور ان کے احکام کی خلاف ورزی کے تصور تک سے کانپنے لگا۔ خلاف ورزی احکام، تو ایک طرف اگر ان کی شان کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی خیال گزرا تو یہ وہم گیا کہ نہ معلوم اب کیا قیامت آجائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ یہاں تک بڑھ گیا کہ زندہ انسانوں تو ایک طرف مُردوں تک کے متعلق یہ عقیدہ قائم

مُردوں کی پرستش

کر لیا گیا کہ وہ بڑی قوتوں کے مالک ہیں۔ ان کے اختیارات بڑے وسیع ہیں ان کو خوش کرنے سے انسان کی مرادیں بر آتی ہیں ان کی ناراضگی سے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں جن سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

قرآن آیا اور اس نے کہا کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو خدا بنا کر اس سے ڈرنا اور کانپنا انسانیت کی انتہائی تذلیل ہے کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار حاصل نہیں۔ انسان ہونے کی جہت سے سب برابر اور یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ۔ (۱۹۴)

مساوات انسانیہ

جن لوگوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ تمہارے جیسے (خدا کے) بندے ہیں۔ تم انہیں جن قوتوں کا مالک سمجھتے ہو ان کی حیثیت مکڑی کے جالے سے زیادہ کچھ نہیں۔ مکڑی کے جالے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے لیکن صاحب قوت کے سامنے ایک سیکنڈ کے لئے نہیں ٹھیر سکتا۔ مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا وَ اِنَّ اَوْھَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ (۲۹) جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کو اپنا کارساز و کار فرما سمجھ لیتے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے۔ وہ ایک گھر بناتی ہے۔ لیکن کیسا گھر؟ دنیا میں سب سے زیادہ کمزور گھر۔ انسان جن اپنے جیسے انسانوں کو اپنا "خدا" بنا لیتا ہے ان کی اپنی قوت کچھ نہیں ہوتی جب تک انہیں خدا مانتے رہیئے وہ خدا بنے بیٹھے رہتے ہیں جب انہیں ایسا ماننا چھوڑ دیجئے ان کی خدائی ختم ہو جاتی ہے۔

> ایں خدا را سجدہ اش کردی خدا است
> چو یکے اندر قیام آئی فنا ست

لہٰذا کسی انسان کو خدا بنا کر اس کے سامنے جھکنا شرف انسانیت کی انتہائی تذلیل ہے۔ اور جب زندہ

انسان کے سامنے جھکنے کی یہ کیفیت ہے، تو مردہ انسان کے حضور، زندہ انسان کا جھکنا اور اس کے سامنے گڑگڑانا انسانیت کی ایسی ذلت ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ انسانوں کو خدا بنا لینے والا خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ اپنے ہاتھوں آپ ذلیل ہوتا ہے۔

مقامِ آدم قرآن نے انسان سے کہا کہ تیری دُنیا میں تجھ سے بلند مقام کسی کا نہیں۔ فطرت کی قوتیں سب تیری خادم ہیں تو ان کا مخدوم اور مسجود ہے۔ باقی رہے انسان۔ سو انسان ہونے کی حیثیت سے سب ایک جیسے ہیں۔

ہاں! انسان سے بلند اور بالا مقام صرف ایک ہستی کا ہے اور وہ ہے ذاتِ خداوندی۔ جس نے تمام کائنات کو پیدا کیا اور خود انسان کو بھی۔ لیکن خدا کی ذات بھی ایسی نہیں جس سے انسان ڈرے اور سہمے۔

قانون والا خدا ڈرنا اور کانپنا اس سے ہوتا ہے جس کے پاس قوت بے پناہ ہو لیکن وہ کسی قاعدے اور قانون۔ ضابطے اور اصول کا پابند نہ ہو۔ جس کے متعلق معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کس بات سے ناراض ہو جائے گا اور کس سے خوش۔ وہ کب خلعت بخش دے گا اور کب کھال کھنچوا دے گا۔ قرآن نے بتایا کہ خدا کی ذات ایسی نہیں۔ اس کی قوتیں بیشک لامحدود ہیں لیکن وہ ان کا استعمال (معاذ اللہ) اندھا دھند نہیں کرتا۔ ان اصولوں کے ماتحت کرتا ہے جو اس نے خود وضع کئے ہیں اور جن پر وہ خود اپنی مرضی سے پابند ہے اور پابند بھی ایسا کہ ان سے کبھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹتا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲) اور تم خدا کے اصولوں میں کبھی تغیر و تبدل نہیں دیکھو گے۔ اگر تم اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کام کرتے جاؤ گے تو تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا اور اگر ان کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کے تباہ کن نتائج سے تمہیں کوئی بچا نہیں سکے گا۔ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ (۱۰/۱۰۷) اگر قانونِ خداوندی کے مطابق تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچ رہا ہو تو کوئی نہیں جو اسے رفع کر سکے اور اگر اس کے قانون کے مطابق کچھ فائدہ پہنچ رہا ہو تو کسی کی طاقت نہیں جو اس نفع کو تم تک پہنچنے سے روک لے۔

غور کیجئے۔ جس صاحبِ اقتدار کی کیفیت یہ ہو کہ اس نے ہر کام کے نتیجے کے لئے غیر متبدل قوانین مرتب کر دئے ہوں اس میں کبھی، کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوتی ہو، اس کی مملکت میں رہنے والے انسان

خوف سے مامون کس قدر خوف سے مامون ہوں گے۔ انہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ وہ ڈریں گے تو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈریں گے (اس کو خشیۃ اللہ۔ یا خدا سے ڈرنا کہتے ہیں) ... جیسے ہم آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ڈرتے ہیں اگر ہم ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتے تو ہمارے لئے ڈرنے

اور خوف کھانے کی کوئی بات نہیں ـــــ اور چونکہ ساری کائنات میں قانون صرف خدا کا کارفرما ہے اس میں کوئی اور قوت شریک نہیں (وَ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا - ۱۸/۲۶) اس لئے قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے والے کو نہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہے نہ کسی کے سامنے جھکنے اور گڑگڑانے کی حاجت ـــــ خواہ وہ فطرت کی کوئی قوت ہو یا کوئی مردہ یا زندہ انسان۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ وہ کائنات میں سر اٹھا کر چلتا ہے اور دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹ سے مستانہ وار گزر جاتا ہے اس کے شرف انسانیت کو کہیں ٹھیس نہیں لگتی کسی مقام پر اس کی تذلیل نہیں ہوتی وہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کی زندہ شہادت ہوتا ہے۔ اسے ہر طرح کا امن حاصل ہوتا ہے (ایمان کا لازمی نتیجہ امن ہے اس کا مادہ ہی ا۔ م۔ ن ہے۔ مومن وہ ہے جو خود بھی امن میں ہو اور دوسروں کو بھی امن میں رکھے وہ نہ خود کسی کے سامنے جھکے نہ کسی کو اپنے سامنے جھکائے)

شرک کی دیگر اقسام

۴۔ لوگوں کے سامنے عام طور پر شرک کی ایک ہی شکل تھی یعنی بت پرستی۔ لیکن قرآن کریم کی نگہ دور رس اور جہانگیر نے ان محسوس ہیکلوں سے آگے بڑھ کر ان خداؤں کی بھی نشاندہی کر دی جو انسان کے قلب کی گہرائیوں میں پوشیدہ اور اس کے خون کے ذرات میں حلول کردہ ہوتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ توحید نام ہے خالصتہً قوانین خداوندی کے اتباع کا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کو قانون کے اتباع سے کون سی چیز روکتی ہے؟ اس کے جذبات! لہٰذا جو انسان قوانین خداوندی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے قرآن کریم اسے بھی شرک قرار دیتا ہے۔ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (۲۵/۴۳) کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ جب انسانی جذبات قوانین خداوندی سے سرکشی برت کر اپنی من مانی کرنے لگیں تو قرآن اسے شیطنت سے تعبیر کرتا ہے اور شیطان کے متعلق واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس کا غلبہ مشرکین پر ہوتا ہے (۱۶/۱۰۰) یعنی انسان کا، قوانین خداوندی کو چھوڑ کر خود اپنے جذبات کے پیچھے لگ جانا شرک ہے اور ایسا کرنے والا مشرک۔

اسی طرح قرآن نے فرقہ پرستی کو بھی شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۲) اس لئے کہ اس میں بھی انسان، قوانین خداوندی کے اتباع کی بجائے اس انسان یا انسانوں کے گروہ کا اتباع کرتا ہے جن کی طرف وہ فرقہ منسوب ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسا شخص خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے اس قدر نہیں ڈرتا جس قدر اپنے فرقہ کے بانی ـــ یا اس کے تائیدے کے کسی حکم کی نافرمانی سے خوف کھاتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے شرک کیا ہے۔؟ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنا شرک ہے۔ مثلاً

(۱) فطرت کی قوتوں کا مقام یہ ہے کہ وہ انسان کی خادم اور تابع تسخیر ہیں (انہیں ان ۱۸۱۸۱) سے بلند و بالا

سمجھنا، انہیں ان کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے

(۲) تمام انسان، انسان ہونے کے اعتبار سے یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکائے۔ لہٰذا کسی انسان کو یہ حیثیت دے دینا کہ دوسرے انسان اس کے سامنے جھکیں اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے

(۳) مُردہ بدست زندہ" عام محاورہ ہے اور حقیقت پر مبنی۔ لیکن مردوں کو ایسا صاحب اقتدار سمجھ لینا کہ وہ زندہ انسانوں کے مقدرات کو بنا اور بگاڑ سکتے ہیں، مُردہ کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

(۴) خدا کی ذات ایسی ہے کہ انسان اس کے قوانین کا اتباع کرے اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔ اس اطاعت اور اتباع میں کسی اور کو شریک سمجھ لینا خدا کو اس کے صحیح ــ بلند و بالا مقام سے نیچے لے آنا ہے۔

"کسی شے کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے" کو عربی زبان میں ظلم کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے سب سے بڑا ظلم شرک ہے اور اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے جب کہا ہے کہ۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (۳۱/۱۳)

شرک ظلم عظیم ہے۔ اس میں کوئی شے اپنے اصلی مقام پر نہیں رہتی۔ باقی چیزوں کو تو چھوڑیئے۔ اس میں انسان اپنے بلند اور رفیع مقام سے اس بُری طرح گرتا ہے کہ اس کے شرف و مجد کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ دیکھئے قرآن نے اس حقیقت کو کیسے دل نشین انداز سے بیان کیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ــ جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی شخص آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرے۔ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ پھر اسے کوئی (عقاب یا چیل) اُچک کر لے جائے اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲/۳۱) یا جیسے گھاس کا کوئی تنکا ہو جیسے تند و تیز ہوا ادھر اُدھر اڑائے اڑائے پھرے اور کسی دور دراز مقام پر لے جاکر پھینکدے۔

شرک سے پستی

آپ نے دیکھا کہ شرک انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے۔ یہ اسے اس کے مقام آدمیت سے گرا کر ذلت و خواری کی انتہائی پستیوں میں پہنچا دیتا ہے وہ یوں ڈرا سہما ہوا رہتا ہے جیسے چڑیا کا ننھا بچہ گھونسلے سے نیچے گر پڑا ہو اور جس تیز چنگل والے پرندے کا جی چاہے اُسے اُچک کر لے جائے وہ اس قدر بے بس اور بے حقیقت ہو جاتا ہے کہ ہوا کا ہر تیز و تند جھونکا اسے جدھر چاہے اڑائے اڑائے پھرتا ہے۔ شرک سے یہ کیفیت ہو جاتی ہے اس انسان

کی جسے خالقِ کائنات نے ایسا بلند اور مستحکم مقام عطا کیا تھا۔

اختیار و ارادہ

قرآن کریم نے انسان کا سب سے بڑا شرف یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے اُسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے اور پھر اس کے اس شرف کا اس قدر احترام کیا ہے کہ وہ اس کے اس اختیار و ارادہ کو اس سے کبھی نہیں چھینتا۔ وہ اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (تم اپنے دائرۂ اختیارات میں اپنی مشیت کے مطابق کام کرو۔ تم اپنے فیصلوں کے مطابق جس طرح جی میں آئے کرو۔ یہ ہے انسان کا مقام بلند۔ لیکن شرک میں انسان اپنے اختیار و ارادہ کو دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے اور اس طرح شرفِ انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کہاں تک آگے جاتا ہے اور انسان کو کس قدر بلند مقام تفویض کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شرک سے انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اپنے فیصلوں اور کاموں کی ذمہ داری لینے سے ڈرتا ہے۔ اس میں اتنی جرأت نہیں رہتی کہ وہ مردانہ وار کہے کہ ہاں! میں نے یہ کیا ہے اور میں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ اس کے برعکس وہ چاہتا ہے کہ اپنے اعمال کی ذمہ داری دوسروں کے سر تھوپ دے۔ سورۂ نحل میں ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (۱۶/۳۵) اور جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرتے۔ دیکھا آپ نے! شرک سے انسان کے حوصلے کس قدر پست ہو جاتے ہیں۔

تصریحاتِ بالا سے یہ نکتہ واضح ہو گیا ہو گا کہ شرک سے مفہوم کیا ہے اور اس سے قرآن کریم نے اس شدت سے کیوں منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات میں بہت بلند مقام عطا کیا ہے۔ لیکن شرک سے انسان اپنے آپ کو اس بلند مقام سے گرا کر ذلت و پستی کے عمیق گڑھے میں جا پہنچتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا۔ اگر انسان ہمارے پروگرام کے مطابق چلتا تو یہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جاتا۔ وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ۔ لیکن یہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک جاتا ہے وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ یعنی ہمارے قوانین کا اتباع کر کے دنیا میں سرفرازی سے چلنے کے بجائے اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور یوں شرف و مجد کی بلندیوں سے گر کر ذلت و خواری کی پستیوں میں جا پہنچتا ہے یہ ہے شرک کا نتیجہ۔ یعنی اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ خود انسان اپنے بلند مقام کو کھو دیتا ہے اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ اور کوئی نقصان بھی ہو اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب انسان اپنے مقامِ انسانیت ہی سے گر جائے تو اس نقصان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کے اس ارشاد کا کہ اِنَّ اللّٰهَ

شرک کی خرابیاں

لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۔ (۴/۱۱۶)۔ خدا کے قانون مشیت کے مطابق انسان کے ہر غلط اقدام کے نقصان رساں نتیجہ سے حفاظت کا سامان مل سکتا ہے لیکن جو نقصان شرک سے مرتب ہوتا ہے اس سے حفاظت نہیں مل سکتی۔ انسان اپنے مقام کو نہ کھوئے تو اس کی لغزشوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے مقام بلند ہی کو کھو بیٹھے تو اس نقصان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی دنیا میں شرک سے بڑا جرم کوئی نہیں۔ اس سے انسان اپنے بلند مقام بلند سے گر جاتا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیم کا مقصود دمنتہیٰ انسان کو اس کے صحیح مقام تک پہنچا دینا ہے اور یہ توحید کے سوا ممکن ہی نہیں۔ یعنی اس ایمان کے سوا کہ جھکنا صرف قوانین خداوندی کے سامنے ہے۔ کسی اور کے سامنے نہیں۔

یہ ہے صحیح مقام انسانیت!

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی

علمی اور تاریخی کاوشوں کا شاہکار

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد عثمانی نے اردو زبان میں منتقل کیا۔

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ جب

آفتاب اسلام کی جلوہ باریوں نے بزم انسانی کو منور کیا۔

ضخامت۔ ۹۰۰ صفحات ___ قیمت۔ آٹھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترکِ دُنیا

ذہنِ انسانی نے جو تباہ کن غلطیاں کی ہیں ان میں ایک بہت بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ مادہ (MATTER) انسانی "روحانی" ترقی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا ہے۔ جب تک یہ راستے سے نہیں ہٹتا انسان اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان دنیا اور اس کی تمام جاذبیتوں سے نفرت کرے۔ اس سے دور بھاگے۔ جس قدر یہ دنیاوی علائق سے کٹتا جائے گا اسی قدر "روحانیت" میں آگے بڑھتا جائے گا۔ یونان۔ مصر۔ ایران کا فلسفۂ تضاد (یعنی روح اور مادہ کے ایک دوسرے کے ضد ہونے کا نظریہ)۔ عیسائیت اور بدھ مت کی رہبانیت۔ ہندو دھرم کا ویدانت۔ سب اسی اصل کی شاخیں ہیں۔ اس تصور نے انسانیت کو جس قدر تباہ کیا تاریخ کے اوراق اس موقع پر شاہد ہیں۔

قرآن آیا اور اس نے جہاں ذہنِ انسانی کے تراشیدہ دیگر غلط تصورات کا ابطال کیا وہاں اس باطل نظریہ کی بھی جڑ کاٹ دی جس نے انسانیت کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ انسانی زندگی کا مقصد مادی دنیا کا ترک نہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ مادی کائنات کو مسخر کرے اور پھر اسے قوانین خداوندی کے مطابق، نوعِ انسان کی بہبود کے لئے صرف کرے۔ یہ ایک عظیم پیغام تھا جس نے انسان کی دنیائے فکر و عمل میں انقلاب برپا کر دیا۔

لیکن ہماری اور ہماری وجہ سے دنیائے انسانیت کی — بدقسمتی کہ کچھ عرصے کے بعد قرآن کا یہ انقلاب آفرین پیغام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور ہمارے ہاں بھی وہی نظریات عین اسلام بن گئے جنہیں اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا اور دنیا سے نفرت، مقصودِ حیات قرار پا گیا۔ ابتداءً یہ تصور خانقاہیت کی چار دیواری کے اندر محصور تھا۔ اور تصوف اس کا علمبردار، لیکن رفتہ رفتہ اس باب میں طریقت اور شریعت کی حدیں آپس میں مل گئیں اور دنیا سے نفرت، اسلام کا عالمگیر بنیادی اصول قرار پا گیا۔ اب اس اصول کی تبلیغ جس طرح ارباب طریقت کی مسندوں سے ہوتی ہے اسی طرح اصحاب شریعت کے منبروں سے بھی ہوتی ہے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ

کیجئے۔ یہ مثالیں دیوبند سے شائع ہونے والے رسالہ تذکرہ (بابت اگست ۱۹۶۳ء) میں شائع شدہ ایک مضمون سے لی گئی ہیں جس کا عنوان ہے ـــــ پند و نصائح ـــــ اور جو خود ادارہ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ غور سے پڑھئے اور پھر سوچئے کہ اسلام کیا تھا اور کیا ہو گیا ـــــ طلوع اسلام۔

- دنیا ایک بیمارستان ہے اور لوگ اس میں دیوانوں کی مانند ہیں اور دیوانوں کے لئے بیمارستان میں قید و زنجیر ہوتی ہے۔ (حضرت فضیل بن عیاضؒ وفات ۱۸۰ھ)
- حصول آخرت کا ذریعہ ترک دنیا ہے۔ جس دل میں دنیا کی محبت ہوتی ہے اس دل میں آخرت کی دوستی باقی نہیں رہتی (حضرت ابوسلیمان دارانی ۲۱۵)
- دنیا مثل مذبح کے ہے اور کتوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ جو شخص دنیا کے حاصل پر بیٹھا ہے وہ کتوں سے بھی بدتر ہے کیونکہ کتا جب اپنی حاجت پوری کر لیتا ہے تو وہ بھی مذبح سے واپس جاتا ہے۔ (حضرت احمد حماریؒ وفات ۲۳۲ھ)
- تمام انبیاءؑ اور اولیاءؒ نے دنیا کو ترک کیا ہے اور اس سے بیزاری ظاہر کی ہے، پھر جو شخص ان کی خلاف ورزی کرے وہ کیوں کر مسلمان ہو سکتا ہے۔

(حضرت سلطان باہوؒ وفات ۱۱۰۲ھ)

- دنیا کی محبت زہر قاتل کا اثر رکھتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ زہر سے جان ہلاک ہوتی ہے اور حب دنیا سے ایمان جاتا رہتا ہے۔

(حضرت سلطان باہوؒ وفات ۱۱۰۲ھ)

- دنیا ایمان کو اس طرح کھاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔ (ایک بزرگ)
- جو دنیا کا دوست ہے وہ ہرگز خدا کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اور جو خدا کا دوست ہے وہ ہرگز دنیا کا دوست نہیں ہو سکتا۔

(حضرت ابن شہریار گازرونیؒ وفات ۴۲۶ھ)

- دنیا ظاہر میں میٹھی ہے اور صورت میں تازگی رکھتی ہے لیکن حقیقت میں زہر قاتل۔ اور جھوٹا اسباب اور بیہودہ گرفتاری ہے۔ اس کا مقبول خوار اور اس کا عاشق مجنون ہے۔ اس کا حکم اس

نجاست کا سا ہے جو سونے میں منڈھی ہو اور اس کی مثال اس زہر کی سی ہے جو شکر میں ملا ہوا ہو۔ دانا نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ میرا مال زمانہ بھر میں سے کسی عقلمند کو دیں تو زاہد کو دینا چاہیئے جو دنیا سے بے رغبت ہے

(حضرت مجدد الف ثانیؒ وفات ۱۰۳۴ھ)

- دین و دنیا کا جمع کرنا دو ضدوں کا جمع کرنا ہے۔ پس طالب آخرت کے لئے دنیا کا ترک کرنا ضروری ہے اور اس وقت اس کا حقیقی ترک میسر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مشکل ہے تو ناچار ترک حکمی ہی قرار پکڑنا چاہیئے اور ترک حکمی سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی امور میں شریعت روشن کے حکم کے مطابق چلنا چاہیئے[1]۔

(حضرت مجدد الف ثانیؒ وفات ۱۰۳۴ھ)

- اپنی زندگی میں اپنے نفس کو مردہ بنا لو تاکہ موت کے بعد مردوں میں تم زندہ نظر آؤ۔

(حضرت ذوالنون مصریؒ)

- جو شخص اپنے نفس کو نہیں پہچانتا وہ دین میں دھوکا کھاتا ہے۔

(حضرت شیخ احمد حواری وفات ۲۳۲ھ)

- نفس کو مار ڈال تاکہ خود زندہ ہو جائے۔

(حضرت شیخ احمد خضرویہؒ وفات ۲۴۰ھ)

یہ ہے وہ تعلیم جس نے مسلمانوں جیسی انقلاب آفریں قوم کو قبرستانوں کا مجاور بنا دیا۔ اقبال کے الفاظ ہیں:

چہ گویمت کہ چہ بودی، چہ کردۂ، چہ شدی
کہ خوں کند جگرم را ایازیِ محمود
تو آں نہ کہ مصلیٰ ز کہکشاں می کرد؟
شراب صوفی و شاعر ترا ز خویش ربود[2]

---

[1] یہ صحیح مسلک ہے۔ یعنی دنیا کو پوری طرح حاصل کرے اور اس کا استعمال قوانین خداوندی کے مطابق کرے۔
[2] اس اجمال کی تفصیل پرویز صاحب کی کتاب "اسباب زوال امت" (تازہ ایڈیشن) میں ملاحظہ فرمائیے۔

نقد و نظر

شعر العرب

عربی زبان سے مسلمانوں کا جو گہرا تعلق ہے، اس کی بابت ہم طلوعِ اسلام کے صفحات میں متعدد بار لکھ چکے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ اشد ضروری ہے کہ یہاں عربی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ لیکن یہ تو مستقبل کے لئے ہوگا اور وہ بھی اس وقت جب ہمارے نصابِ تعلیم میں یہ مضمون لازمی قرار پاگیا)۔ جو لوگ سردست عربی خواندہ نہیں انھیں عربی لٹریچر سے آشنا کرانے کا ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ یہ کہ عربی زبان کی اعلیٰ مفید کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں شائع کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اور جہاں کوئی ایسی کوشش ہوتی ہے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ امام ابن قتیبۃ الدینوری کی کتاب الشعر والشعراء (پہلی جلد) کا اردو ترجمہ ہے جو پروفیسر عبدالصمد صاحب صارم کی کاوش کا نتیجہ ہے، اور جسے مجلس احیائے علوم الدین (لاہور) نے شائع کیا ہے۔ ابن قتیبہ تیسری صدی ہجری کے نحو و لغت کے امام ہیں۔ ان کی اس کتاب میں، شعرائے جاہلیت سے لے کر عباسی دور کے شاعر (الاشجع السلمی) تک کا مختصر سا تذکرہ اور کلام کا منتخب نمونہ درج ہے کسی زبان (اور بالخصوص عربی زبان) کے شعر کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا جس قدر مشکل کام ہے، اس سے اربابِ نظر بخوبی واقف ہیں۔ پروفیسر صارم صاحب نے اس کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو بات اصل (شعر) میں ہوتی ہے وہ ترجمہ میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ بایں ہمہ کتاب مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اگر پروفیسر صاحب شعراء کے تذکرہ میں ترجمہ تک اکتفا نہ کرتے، بلکہ اپنی طرف سے اضافہ کے ساتھ ان کے مزید کوائف بھی درج کر دیتے تو کتاب زیادہ مفید اور دلچسپ ہوتی۔ امید ہے وہ دوسرے ایڈیشن میں یہ کمی پوری کر دیں گے۔ نیز اکثر اشعار کے ترجمہ کے ساتھ حواشی بھی دیدیں گے کہ عربی کے جن الفاظ (یا محاورہ) کا اردو میں یوں ترجمہ کیا گیا ہے، اہلِ عرب ان الفاظ کا یہ مفہوم لیتے ہیں، یا اس محاورہ

کو ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ ان تشریحات سے اردو داں طبقہ، عربی شعر کی خصوصیات سے زیادہ لذت یاب ہو سکے گا۔

کتاب، متوسط تقطیع کے قریب سوا چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اور قیمت فی جلد (غیر مجلد) آٹھ روپیہ ہے۔ (ایسی کتاب میں کاغذ ذرا اچھا لگنا چاہیئے تھا)۔

۲۔ فردوسِ گم گشتہ

قرآن کریم کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کی طرف اپنے پیغامبر بھیجے۔ (تا آنکہ آخری نبی، تمام نوعِ انسان کی طرف، ہمیشہ کے لئے رسول بن کر مبعوث ہوئے صلی اللہ علیہ وسلم)۔ ان میں سے، ان رسولوں کا، جن سے اس زمانے کے مخاطب عرب بالعموم واقف تھے، قرآن نے بصراحت ذکر کیا ہے اور باقیوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ قرآن کریم کے اس بیان کے مطابق ایک تسلیم کر لینے میں کوئی باک نہیں کہ ہندوستان کے (غیر مسلم) باشندے، جن بزرگوں کو اپنے مذہب کا بانی قرار دیتے ہیں، وہ (اگر رسول اللہ سے پہلے پیدا ہوئے تھے) تو ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کے رسول ہوں (جن کی تعلیم رسول اللہ کے علاوہ، باقی رسولوں کی تعلیم کی طرح) اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں رہی۔ ان میں گوتم بدھ کو خاص شہرت اور اہمیت حاصل ہے، اگرچہ جو تعلیم ان کی طرف اس وقت منسوب کی جاتی ہے، وہ آسمانی تعلیم نہیں کہلا سکتی۔

مہاراجہ اشوک، اس مذہب (بدھ مت) کا بہت بڑا عقیدت مند اور مبلغ گذرا ہے۔ اس نے اپنے کتبوں اور لاٹھوں پر بدھ مت کے بنیادی اصول کندہ کرائے تھے۔ کچھ عرصہ سے ان کتبوں اور لاٹھوں پر منقوش الفاظ کی تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ شیخ عبد القادر صاحب کا زیرِ نظر پمفلٹ، اس تحقیق پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے، اشوک کے پیش کردہ بدھ مت کے اصولوں کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ ان میں بہت سی باتیں بڑے کام کی ہیں، اور بدھ مت کی عام مروجہ تعلیم کے مقابلہ میں، صداقت سے زیادہ قریب۔ یہ پمفلٹ جامعہ احمدیہ (ربوہ) کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ قیمت اس پر درج نہیں۔

۳۔ شہابِ ثاقب

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی کتاب "فجر الاسلام" میں (جس کا اردو ترجمہ ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع ہو چکا ہے) ایک مقام پر ان اعتراضات کو جمع کیا ہے جو "نہج البلاغۃ" کے حضرت علیؓ کا کلام ہونے پر کئے جا سکتے ہیں۔ سید حشمت حسین جعفری صاحب نے زیرِ نظر پمفلٹ میں ان اعتراضات کا جواب دے کر بتایا ہے کہ نہج البلاغۃ مستند طور پر حضرت علیؓ کے کلام پر مشتمل ہے۔ اس

پمفلٹ کو مکتبہ افکار اسلامی حیدر آباد نے شائع کیا ہے۔ صفحات ۹۶۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔

۴۔ مسلمانوں کے فرقے

جناب غلام احمد صاحب (المعروف کاشانہ وکیل۔ نظام آباد۔ حیدر آباد دکن) نے اس مختصر سے رسالہ میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے بنیادی مسئلے اور عقائد کا تعارف کرایا ہے۔ آخر میں فرقہ بندی کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اس بات کے ثبوت میں مسلمانوں کے زائد از چار سو فرقوں کی فہرست آپ کے سامنے ہے اور دوسری طرف تاریخ کے اوراق بھی موجود ہیں کہ صرف چالیس اسلام کے علمبرداروں نے خلافت زمین کے انتظام کو کس طرح حاصل کیا تھا اور تعلیم اسلام کا ڈنکہ چار دانگ عالم میں بجوا دیا تھا جن کے پیش نظر

یک گہر بودیم ہم چو آفتاب
بے گرہ بودیم صافی ہم چو آب

مصنف کی تحریر سے ملت کا درد اور اخلاص نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے ـــــ اور وہ کوئی مخلص اور حساس مسلمان ہے جس کا دل امت کے انتشار اور تفرقہ پر خون کے آنسو نہیں روتا ـــــ

پمفلٹ مصنف سے ایک روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) میں مل سکتا ہے۔

مفت

دوا برائے دمہ و درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ:۔ حاجی محمد دین۔ شیخ آئس فیکٹری متصل گنیش گھوپڑا ملز۔ لارنس روڈ۔ کراچی

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگالیں

نئی نسل کے قلب و نگاہ کے لئے

دینِ خداوندی کی دعوتِ انقلاب

"سلیم کے نام خطوط"

(تین جلدوں میں) (از پرویز)

◉ خالص قرآنی فکر کی روشنی میں عصرِ حاضر کے اہم ترین مسائلِ حیات کا حل۔

◉ مفکرِ قرآن کا مخصوص دلنشین اور حقیقت آفریں اندازِ نگارش۔

اہم عنوانات ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟ ذات پات کی تمیز۔ طلاق کا قرآنی مفہوم اسلامی نظام کے بنیادی اصول۔ مغربی اور قرآنی تہذیب کے بنیادی اصول، کمیونزم اور اسلام صلوٰۃ و زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم۔ خدا کا تصور۔ مقامِ محمدیؐ۔ کائنات کے دو عظیم انقلاب۔ رحمۃ للعالمین۔ درود کا مفہوم۔ اطاعتِ رسولؐ۔ اسلامی قانون شریعت کے ماخذ۔ جشنِ نزول قرآن۔ اندھے کی لکڑی۔ تصوف قرآن کی روشنی میں، ہماری تاریخ، اسلامی آئیڈیالوجی۔ اسلام آگے کیوں نہ چلا؟

◉ تین جلدیں چوالیس اہم خطوط پر مشتمل ہیں ◉

عمدہ سفید کاغذ ——— ٹائپ کی بہترین دیدہ زیب طباعت ——— حسنِ صوری و معنوی سے آراستہ

جلد اوّل آٹھ روپے ——— جلد دوم چھ روپے ——— جلد سوم چھ روپے

طاہرہ کے نام خطوط

(دو جلدوں میں)

عائلی زندگی کے بنیادی اور الجھے ہوئے مسائل ان مسائل کے بارے میں مفکرِ قرآن نے اپنی ملت کی طاہرہ بیٹیوں کو مخصوص مشفقانہ انداز سے مخاطب کیا ہے۔ خدا کی آخری کتاب ان الجھنوں کا کیا حل پیش کرتی ہے؟ آنسوؤں اور آہوں کے جہنم میں کیونکر جنتی معاشرے کی صحیح بہار نمودار ہو سکے گی؟ ان سوالات کا جواب ملت کی ہر بہو بیٹی کو ان خطوط میں ملیگا۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ نمبر ۲ شاہ عالم مارکیٹ لاہور — جلد اول۔ دو روپے ——— جلد دوم۔ ڈھائی روپے

مکمل فہرست کتب ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب کریں۔

میری نظر میں ہیں تمام تیرے گذشتہ روز و شب
اقبالؒ

احتساب

(۵)

قلب و نگاہ کی پوری ہم آہنگی سے طلوعِ اسلام نے مسلسل تحریکِ پاکستان کی حمایت اور نصرت کا حق ادا کیا تھا۔ تحریک کی کامیابی سے اس خطۂ زمین میں ایک نئی مملکت ابھر کر سامنے آئی تو طلوعِ اسلام بھی انقلابِ حیات کے نئے تقاضوں کو لبیک کہتا ہوا آگے بڑھا اور جب بھی اس نے یہ محسوس کیا کہ کارفرمایانِ مملکت کے کسی اقدام سے مملکت کی تعمیر کو خطرہ لاحق ہو رہا ہے تو اس نے پوری جرأت اور خلوص سے احتساب کا فریضہ ادا کیا۔ گذشتہ پانچ کے شمارے میں اس روئیداد کی چوتھی قسط شائع ہوئی تھی۔ اشاعتِ زیرِ نظر سے یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ (ادارہ)

ہمارا بین الاقوامی مقام

مارچ ۱۹۵۳ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے لمعات میں بین الاقوامی محاذ کے جنگی فریقین (امریکہ و روس) کے مختلف اقوامِ عالم سے گٹھ جوڑ کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور پھر اس کی روشنی میں مسلم ممالک کو ان کا حقیقی مقام اور ملی فریضہ یوں یاد دلایا گیا ہے۔

مسلمانانِ عالم کے لئے سیدھی راہ یہ ہے کہ وہ نہ امریکن بلاک کی تقویت کا باعث بنیں اور نہ روس کی عداوت کا موجب۔ ان کے نزدیک سنگِ زر اور برادرِ شغال دونوں یکساں ہیں۔ امریکہ کی خدا پرستی کا دعویٰ قرآن کی رو سے، قطعاً خدا پرستی نہیں اور روس کا یہ دعویٰ کہ وہ مزدوروں اور غربا کی امداد کیلئے اٹھا ہے ایسی حق کی آواز ہے جو باطل کی تائید کے لئے بطور دلیل استعمال کی جا رہی ہے (کلمۃ حق اریدبہا الباطل)۔ ان کے لئے صحیح راہِ عمل صرف ایک ہے کہ وہ خود امتِ واحدہ بنکر قرآن کا نظامِ ربوبیت اپنے ہاں رائج کریں اور پھر دیکھیں کہ کس طرح روس اور امریکہ دونوں ان کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

(شمارہ مارچ ۱۹۵۳ء ۔ صفحہ ۱)

صوبائی تعصبات

یہی ایام تھے جب بعض لیڈروں کی مفاد پرستیوں نے صوبائی تعصبات اور تفرقہ بازی کے شعلوں کو ہوا دے رکھی تھی۔ اس سلسلے میں ڈان، کراچی کے افتتاحیہ کا ذکر کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

پاکستان کے مسلمانوں میں مشرق و مغرب کی تمیز و تفریق ایک حقیقتِ ابدی کا بطلان اور ایک صداقتِ ازلی کی تکذیب ہے۔ ہم اپنے سینوں کو اس آفتابِ جہانتاب کی درخشندہ شعاعوں سے مستنیر کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں جس کے متعلق فرمایا گیا کہ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ (جو نہ شرقی ہے، نہ غربی) اس لئے اگر ہمارے ذہن میں ایک ثانیہ کے لئے بھی مشرقی و مغربی پاکستان میں کسی قسم کی مغائرت و تفریق کا تصور آ گیا تو ہم ان ازلی صداقتوں کے منکر ہوں گے جن پر ایمان ہمارے لئے وجہ سعادتِ کونین ہے۔ یہ امتیازات اس دورِ جاہلیت کی تخلیق تھے جسے ہم جھٹک کر الگ کر چکے ہیں۔ اس لئے اب اس کی یاد تک بھی ہمارے دلوں میں نہیں آنی چاہیئے کہ جو بت حریمِ کعبہ سے ایک مرتبہ نکال دیئے گئے وہ وہاں دوبارہ باریابی نہیں پا سکتے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۱)

محلاتی سازشیں

پاکستان کے ایک وزیرِ اعظم کی اپنے منصب سے علیحدگی پر طلوعِ اسلام نے صورتِ حال پر بحث کرتے ہوئے لکھا۔

گزشتہ ڈیڑھ برس میں یہ بدبخت ملک جس تیزی سے تباہی اور بربادی کے جہنم میں دھکیلا گیا اس کی نظیر شاید ہی مل سکے۔ اس حکومت کی مثال اس کارندے کی سی ہو گئی تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ (۱۶/۷۶)
اسے کہیں بھیجیئے، کبھی خیر کی خبر لے کر نہیں آئے گا

پھر مصیبت یہی نہیں تھی کہ ملک پر اس بری طرح سے تباہی آ رہی تھی۔ اس سے بڑھ کر مصیبت یہ تھی کہ اس تباہی کو تباہی کہنا جرم قرار پا گیا تھا۔ حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ قوم پر ایک عالمگیر مایوسی چھا چکی تھی۔ لوگ کہنے لگے تھے کہ اس آزادی سے تو غلامی ہزار درجے اچھی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بالآخر اس مصیبت کا حل کیا ہو گا! انہیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ تازہ واردانِ بساطِ حکومت جو ایک خانہ ساز ملی بھگت سے اقتدار کی مسندوں پر قابض ہو چکے ہیں، کبھی ان

کرسیوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ وہ اپنے جی میں سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ جزِ ثقیل جو قوم کے سینے پر کابوس بن کر سوار ہو چکا ہے کبھی نیچے نہیں اتریگا۔ ظاہر ہے کہ قوم پر اس قدر مایوسی کا چھاجانا بڑا خطرناک ہوا کرتا ہے۔ اس کے انجام دعواقب بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ قومیں ہمیشہ امیدوں کے سہارے جیتی اور آرزوؤں کے بل بوتے پر آگے بڑھتی ہیں۔ (شمارہ مئی ۱۹۵۳ء ـــ ص)

آئین و ضوابط کی پابندی ۱۹۵۳ء میں نازک صورت حال کی بنا پر لاہور کا نظم و نسق فوج کے سپرد کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں جہاں اور بہت کچھ ہوا، وہاں یہ خوشگوار صورت بھی سامنے آئی کہ چوری چکاری غنڈہ گردی، بدعنوانی اور رشوت ستانی جیسی بیماریاں بھی دب گئیں۔ دوکانداروں نے ماپ تول، بلیک مارکیٹ اور ٹکٹ کے معاملوں میں بڑے محتاط ہو گئے۔ شہر کی صفائی قابل دید تھی اور سڑکوں پر آمد و رفت میں نظم پیدا ہوگیا۔ اس تبدیلی پر قومی نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

جو قومیں اپنے اندر زندگی کی صلاحیتیں پیدا کرکے آزادی حاصل کرتی ہیں، ان میں آئین و ضوابط کی پابندی اور عام معاشرتی اقدار کا احساس از خود پیدا ہو جاتا ہے انہیں "بائیں کی طرف" چلانے کے لئے کسی سپاہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جو قومیں ان صلاحیتوں کے بغیر آزاد ہو جاتی ہیں ان کے نزدیک آزادی سے مفہوم ہوتا ہے "مادر پدر آزادی"۔ بدقسمتی سے ہمارا شمار اس آخری طبقہ ہی میں ہے۔ چنانچہ یہاں آزادی ملتے ہی حاکم اور محکوم، رعایا اور افسر سب یہ سمجھنے لگ گئے کہ اب نہ کسی آئین کی ضرورت ہے، نہ قانون کی۔ نہ کسی قاعدہ کی پابندی لازم ہے نہ اخلاقی اور معاشرتی اقدار کی۔ یہ بے راہ روی اس قدر عام ہو چکی تھی کہ حساس طبائع پر یکسر مایوسی چھا رہی تھی کہ بالآخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ بارے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہمارا فوجی عنصر اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ معاشرہ کو ان خطوط پر چلا سکے جنہیں صحیح معنوں میں آزاد قومیں از خود قائم رکھا کرتی ہیں۔

لیکن اس قسم کا انتظام صرف ہنگامی طور پر قائم کیا جا سکتا ہے، مستقل طور پر نہیں۔ مستقل طور پر وہی نظام کامیاب ثابت ہو سکتا ہے جس میں آئین و ضوابط کی پابندی دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہماری تعلیم گاہوں میں بچوں اور جوانوں کی تربیت اور تعلیم صحیح طریق پر شروع ہو جائے۔ جب اس قسم کے بچے زندگی کے میدان میں آئیں گے تو ان میں ایک آزاد قوم بننے کی صلاحیتیں پیدا ہوں گی۔

(شمارہ مئی ۱۹۵۳ء ـــ ۱۲-۱۳)

معاشرتی الجھنیں

مئی ۱۹۶۳ء کے لمعات میں لڑائی فساد اور قتل کی روز افزوں واردات اور ان کے محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے اور عوام کی بڑھتی ہوئی اعصابی کمزوری کو اس کی وجہ قرار دیا گیا ہے طلوع اسلام معاملے یہیں ختم نہیں کرتا بلکہ اپنے بھرپور جائزے میں یہ بھی بتاتا ہے کہ اعصاب دن بدن کیوں کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ پوری تفصیل سے بتاتا ہے کہ بلیک مارکیٹ، رشوت ستانی اور اس قسم کی دیگر بدعنوانیاں عوام کی ضروریات زندگی اور دیگر معاملات میں کس قدر اضطراب انگیز اور صبر آزما کیفیت اختیار کر گئی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے۔

> آپ سوچیے کہ جس معاشرہ میں انسان کے ساتھ قدم قدم پر یہ کچھ ہو اس میں اس کے اعصاب اپنی حالت پر قائم کیونکر رہ سکتے ہیں؟ اعصاب ہی تو ہیں، فولاد کی تاریں تو نہیں۔ دل ہی تو ہے سنگ و خشت تو نہیں، جن اعصاب کے ساتھ برسوں سے یہ کچھ ہو رہا ہو وہ بات بات پر تنتنا نہ جائیں تو کیا کریں؟ ابھی تو ابتداء ہے۔ اس صورت حال کو ذرا آگے بڑھنے دیجیے آپ دیکھیں گے کہ معاشرہ میں پاگلوں کی تعداد کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ . . .

یہ کچھ وضاحت کرتے ہوئے وہ صورت حال کی خرابی کے لیے حکومت کو براہ راست ذمہ دار گردانتا ہے اور لکھتا ہے۔

> ملک کی یہ حالت ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جو اندھوں کو بھی دکھائی دیتی ہے لیکن حیرت ہے ہمارے ارباب حل و عقد پر کہ یا تو ان کی آنکھیں ایسی بند ہیں کہ وہ اس حالت کو دیکھ ہی نہیں سکتے اور یا وہ اس قدر خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ حکومتیں اسی طرح چلتی ہیں۔ ملک میں افلاس کا یہ عالم ہے لیکن ان کی بجٹ کی تقریریں پڑھیے۔ ان میں بتایا گیا ہوتا ہے کہ ملک میں ہن برس رہا ہے۔ غذا کی حالت یہ ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ ہمیں اس سوال نے فکر مند کر رکھا ہے کہ ہم اپنے فالتو اناج کو کیا کریں ...... شروع شروع میں لوگ اس قسم کے بیانات اور تقاریر سے مطمئن ہو جایا کرتے تھے لیکن اب حالت یہ ہو چکی ہے کہ اگر ان بیانات میں کوئی سچی بات بھی ہوتی ہے تو لوگ اس کا بھی یقین نہیں کرتے۔ اس ابتری کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار کو اپنے اندرونی خلفشار ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ ان کی تمام توانائیاں اپنی اپنی پارٹی کی تقویت اور اپنی اپنی پوزیشن کے استحکام کی نذر ہو جاتی ہیں۔
>
> (شمارہ مئی ۱۹۶۳ء ــــ صـ)

اقبالؒ اور حکومت

یوم اقبال کی تقریب پر اس سال بھی حکومت پاکستان کے کارفرماؤں نے اپنی روایتی شان بے نیازی کا ثبوت دیا۔ اس بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا۔

۱۸ اپریل تک اس تقریب کے متعلق کسی کو کانوں کان خبر تک نہ تھی۔ ۱۹ اپریل کو اقبال سوسائٹی کی طرف سے ایک پبلک جلسے کا اعلان ہوا۔ یہ جلسہ ۲۱ اپریل کی شب کو منعقد ہوا۔ عوام کو اقبال سے عشق ہے اس لئے وہ اس کے نام پر جوق در جوق جمع ہوگئے لیکن حرام ہے جو اکابرین میں سے کسی ایک کی صورت بھی وہاں دیکھنے کو ملی ہو۔ ظاہراً تزئین و آرائش سے قطع نظر معنوی حیثیت سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی زندگی بخش تقریب نہیں منائی جا رہی۔ اس تقریب کی "تجہیز و تکفین کی رسم" ادا کی جا رہی ہے اور وہ بھی بیگار سمجھ کر......

یہ کچھ مملکتِ پاکستان کے دار السلطنت (کراچی) میں ہوا اور اس زمانے میں ہوا جب وزیر اعظم اور وزرائے کابینہ ہی نہیں بلکہ مجلس قانون ساز کے اراکین تک بھی کراچی میں موجود تھے۔

(شمارہ مئی ۱۹۵۵ء — صہ)

اس کے بعد اس نے جو کچھ کہا وہ اربابِ حکومت کے لئے "تازیانۂ عبرت" کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھا:

اقبالؒ اس سے بہت اونچا ہے کہ اس کی تقریبات منائی جائیں یا نہ منائی جائیں، اس سے اس کی بلندی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس سے یہ ضرور نظر آجاتا ہے کہ ہم کس قدر پست ہیں۔ اور اس پستی کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ (اقبال کی وفات پر جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں اس کی عظمت اور محبت لوگوں کے دلوں میں اور بڑھتی جا رہی ہے لیکن) ہمارے اربابِ حل و عقد کی یہ حالت ہے کہ ان میں سے جس شخص سے مسندِ حکومت چھن جاتی ہے وہ یہیں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے اور کوئی بات تک نہیں پوچھتا۔ یہ فرق ہوتا ہے ذاتی اور اضافی قیمت میں۔

قومیں انہی افراد سے زندہ رہ سکتی ہیں جن میں ذاتی جوہر ہوں اور ایسے افراد کی قدر کرنا وہی لوگ چھوڑتے ہیں جو خود ذاتی جوہروں سے محروم ہوتے ہیں۔ (ایضاً)

عوام اور ان کے کارفرما

اگست ۱۹۵۵ء کے شمارے میں ملکی صورتِ حال کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملک کے اربابِ اقتدار اپنی مفاد پرستیوں کے جنون میں کس قسم کے کھیل کھیل رہے ہیں اور ان سے ملک کا مستقبل کن خطرات سے دوچار ہوگا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حکومت اور پیشوائیت کے گٹھ جوڑ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ

قرآن کی رو سے اس سے بڑھ کر انسانیت کی تذلیل اور نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے مفاد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ جائے۔ غلامی کہتے ہی اسی کو ہیں۔ پاکستان میں

رزق کے سرچشمے سمٹ سمٹا کر چند خاندانوں کے اندر محدود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح زمامِ اقتدار رفتہ رفتہ انہی کے ہاتھوں میں آتی جا رہی ہے۔ یہی وہ لباس ہے جس میں عصرِ حاضر میں ملوکیت جلوہ بار ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں ملوکیت کی جڑیں دن بدن مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ باقی رہی مذہبی پیشوائیت (بصورتِ غیر منقسم) ہندوستان میں اس کی شکل انفرادی تھی لیکن یہاں اس نے جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے جب اور جہاں بھی ایک جتھے کی صورت اختیار کی ہے وہ انسانیت کی لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کے لئے ٹڈی دل بن گئی ہے۔ (شمارہ اگست ۱۹۵۹ء — صفحہ ۹)

اس کے بعد ارباب اقتدار کے عوام سے بُعد و مغائرت کی تفصیل سامنے آتی ہے۔

چاہئے ارباب بست و کشاد نے اپنے آپ کو عوام سے اس قدر الگ رکھ چھوڑا ہے اور وہ اس نچلے طبقے سے اس قدر دور اور بلند ہو چکے ہیں کہ انہیں اب غالباً اس کا احساس تک بھی نہیں رہا کہ عوام کس طرح زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ اجنبی حکومت کو اس لئے اجنبی نہیں کہا جاتا کہ وہ کسی دوسرے ملک کے لوگوں کی حکومت ہوتی ہے۔ وہ اجنبی اس لئے ہوتی ہے کہ اس میں عوام اور حکمران طبقے میں اس قدر بُعد اور غیریت ہوتی ہے کہ لوگ اس حکومت کو اپنی حکومت نہیں بلکہ اجنبی حکومت سمجھ رہے ہیں —— اس سے بھی زیادہ جتنی وہ انگریزوں کی حکومت کو سمجھتے تھے۔ (ایضاً — صفحہ ۱۰)

اس کے بعد ان کی بے حسی اور نالائقی کا ذکر یوں شروع ہوتا ہے۔

باقی رہیں عوام کی جائز شکایات تو ان کے متعلق بار تھک کر یہی سمجھ لینا پڑتا ہے کہ ان حضرات کے پاس وہ آنکھیں ہی نہیں جو اس عذاب کو دیکھ سکیں جس میں یہ کروڑوں انسان بُری طرح مبتلا ہیں۔ وہ کان ہی نہیں جن سے وہ اس چیخ و پکار کو سن سکیں جس سے یہ ساری فضا اس وقت ماتم کدہ بن رہی ہے۔ اور اگر آنکھیں اور کان ہیں تو پھر ان کے سینے میں وہ دل ہی نہیں جو جہنم کے ان شعلوں کی تمازت سے ذرا بھی پگھل سکے جس میں قوم اس بُری طرح سے جھلس رہی ہے۔ اور یا تو ان کے کندھوں پر وہ سر ہی نہیں جو اس خطرہ کا ہی اندازہ کر سکے جو ملک کے لئے (بلکہ خود ان کے اپنے لئے بھی) اس صورتِ حالات سے پیدا ہو رہا ہے اور اس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جہانبانی کے لئے دردمندی کو چھوڑیئے، کم از کم دانشمندی کی تو ضرورت

ہوا کرتی ہے لیکن یہاں تو نہ درد ہے نہ دانش۔ ملک کے عوام ایک عذاب مسلسل سے گزر رہے ہیں اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کسی کو اطمینان کا سانس نصیب ہو۔ دردمندی کا تقاضا تھا کہ اس جہنم کو دیکھکر، ذمہ دار حضرات کا دل خون ہو کر آنکھوں سے بہہ نکلتا اور ان پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی لیکن ہمارے یہ رہنما رہیں کہ کیا مجال جو ان کی عشرت سامانیوں میں ذرا سا بھی خلل پڑ جائے ...... لوگ بیچارے رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، پکار رہے ہیں لیکن اس صحرائے اعظم میں کوئی سننے والا ہی دکھائی نہیں دیتا۔

(ایضاً ـــــ ص۱۱)

اس کے بعد طلوعِ اسلام اس نظام کہن میں انقلاب کی دعوت دیتا ہے۔ ایسے انقلاب کی جو قلب و نگاہ کی گہرائیوں سے ابھرے اور مملکت کی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے، اصلاح احوال کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ملک کی موجودہ قیادت اس باب میں (دانستہ یا نادانستہ) کچھ نہیں کرتی یا کچھ کر سکنے کی اہل نہیں تو کیا ملک کے دوسرے لوگوں کا فریضہ فقط اتنا ہی ہے کہ وہ ان پر تنقید کر کے مطمئن ہو جائیں؟ اگر کشتی کے ملاح سو جائیں یا چپو رکھ کر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہو جائیں تو کیا اہل کشتی کا اتنا ہی کام ہے کہ وہ یہ کہکر کہ ملاح کیسے نا اہل ہیں، خود حقے پینے بیٹھ جائیں؟ کیا کشتی کے ڈوبنے سے فقط ملاحوں کا نقصان ہو گا؟ اہل کشتی کا کچھ نہیں بگڑیگا؟

.... آپ تدبیریں بھی سوچیں، اس میں ایک اصول کو ضرور پیش نظر رکھیں اور وہ یہ کہ حکومت اور مملکت میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ حکومتیں آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ وزارتیں بنتی ہیں اور ٹوٹتی ہیں لیکن مملکت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ آپ اصلاح حال کے لئے غلط کار حکومت کو ضرور بدلئے۔ آپ ملک اور نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے نقصان رساں نظام کی جگہ منفعت بخش اور انسانیت ساز نظام کو قائم کیجئے لیکن اس تبدیلی کی کوشش میں کوئی قدم ایسا نہ اٹھایئے جس سے مملکت کسی طرح کا نقصان پہنچے۔ (ایضاً ـــــ ص۱۲)

حقائق کا سامنا کیجئے

ستمبر ۱۹۵۲ء کے لمعات بڑا ہی اہم موضوع لے کر سامنے آئے۔ ان مقالات میں کارفرمایانِ مملکت کی دعووں، دعاوی اور جذبات انگیز تقریروں کے حوالوں سے بتایا گیا تھا کہ آزادی کے حصول کے بعد بھی ہمارے رہنما حقائق کا سامنا کرنا نہیں سیکھے۔ حالانکہ نئے حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی اہم ذمہ داریوں کی بنا پر وہ اپنی نوزائیدہ مملکت کے ہر معاملہ میں سنجیدگی اختیار کرتے۔

کتنا ہی اہم مسئلہ درپیش ہو۔ کیسا ہی نازک سوال زیر غور ہو۔ کیسا ہی مہیب خطرہ سامنے ہو کیسی ہی جاں فرسا مصیبت سر پر منڈلا رہی ہو۔ ہمارا کوئی لیڈر یہ نہیں بتائے گا کہ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔ اس کا ناک نقشہ اور ما علیہ کیا ہے۔ یہ خطرہ کیوں پیدا ہو رہا ہے۔ یہ گھٹا ہمارے سروں پر کیوں منڈلا رہی ہے۔ اور اب اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے ہمارے سامنے کیا سکیم ہے۔ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کیوں کرنا چاہئے۔ ان میں سے کوئی بات نہیں کی جائے گی۔ بس کہا جائے گا تو یہ کہ تم خدا کی آسمانی آگ ہو۔ اور یہ باطل کا خس و خاشاک ہے۔ اٹھو اور اس خس و خاشاک کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دو۔ (شمارہ ستمبر ۱۹۵۵ء — صـــ)

اور پھر اس کے بعد اس نے یہ حقیقت سمجھائی کہ

جب تک پاکستان کا تصور نہیں ملا تھا ہمارے ہاں اس قسم کی تقریریں ایک حد تک قابل فہم تھیں۔ اس لئے کہ اس وقت ہمارے سامنے کوئی واضح نصب العین اور کوئی متعین پروگرام نہیں تھا ...... پاکستان کا تصور ملنے کے ساتھ ہی زمام قیادت خوش قسمتی سے قائد اعظم جیسے بارد منطقی (COLD LOGICIAN) کے ہاتھ میں آگئی جو ہر مسئلہ کو دو اور دو چار کی طرح سمجھنے اور پانچ اور پانچ دس کی طرح سلجھانے کے عادی تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد ہماری تاریخ نے ایک نیا ورق الٹا۔ اب ایک خطۂ زمین ہمارے پاس تھا جسے ہم نے ایک خاص مقصد کے لئے حاصل کیا تھا۔ اب ہماری منزل بھی متعین تھی اور راستہ بھی۔ ہمارے خطرات بھی واضح تھے اور ان کے حل بھی صاف صاف ...... لہٰذا ہمارے ہاں اس سابقہ "شاعری" کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن ہم گزشتہ سات سال سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے رہنما بدستور اسی "بیت بازی" میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہی لفظی گورکھ دھندے، وہی چھچھے دار تقریریں۔ وہی جذبات انگیز شعلہ فشانیاں اور وہی شاعرانہ رجز خوانیاں۔ اس سات سال میں ہماری مصیبتوں میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ ملک کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی ہے ...... یہ سب کچھ ہوتا گیا ہے لیکن کیا مجال جو ہمارے ارباب حل و عقد کی "شاعری" میں ذرا سا بھی فرق آیا ہو۔ (ایضاً)

ذمہ داریوں سے فرار کشمیر کے بہت بڑے حصہ پر بھارت کے قبضے اور وہاں سے دریاؤں کے رخ موڑنے سے پاکستان کے لئے جن خطروں کا امکان تھا ارباب حکومت کی ان سے بے نیازی پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا۔

اربابِ سیاست پاکستان کو اس کی فرصت کہاں کہ وہ سوچیں کہ ہندوستان دریاؤں کے رُخ موڑ رہا ہے کشمیر میں کس طرح پنجے گاڑ رہا ہے اور پاکستان کو کس طرح مفلوج کر رہا ہے۔ ایک طرف پاکستان میں قدرت نے تباہی مچائی۔ پہلے بنگال میں بے پناہ سیلاب آئے جو بے تحاشہ بارشوں کا نتیجہ تھے۔ ... پھر پنجاب کو بارش نے آگھیرا۔ اکثر بڑے بڑے شہر اور ہزاروں گاؤں دیکھتے دیکھتے زیرِ آب آگئے ...... ادھر قدرت نے یہ تباہی مچا رکھی ہے اور ادھر لیڈرانِ قوم ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور رہی سہی کسر پوری کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

(شمارہ نومبر ۱۹۵۵ء ـــ صفحہ ۶)

سیاسی پارٹیاں سیاسی پارٹیوں کی باہمی آویزشوں اور ٹکراؤ سے ملک کو جن ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑا اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے طلوعِ اسلام نے ایک بار پھر اُن قرآنی حقیقت کو دہرایا۔

جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں سے یہ جواب ملتا ہے کہ فرعون کی سب سے بڑی ابلیسی حکمت یہ تھی کہ وہ ملک کو پارٹیوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ اسلام کے خدا نے ملت میں مختلف پارٹیوں کے وجود کو (خواہ وہ مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں) اپنا غضب اور لعنت قرار دیا ہے اور اسے شرک ٹھہرا دیا ہے۔ جب تک ہماری حالت یہ رہے گی کہ ہمارے لبوں پر اسلام رہے گا اور دلوں میں مغربی معاشرت اور نظام کا تقدس اور عظمت، ہم اسلام کے قریب کبھی نہیں آسکیں گے۔ طلوعِ اسلام نے اپنی پہلی اشاعت (جنوری ۱۹۴۸ء) میں کہا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسے مٹا دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ملک میں باقی پارٹیوں کے وجود کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا جائے۔ اس پر کسی نے توجہ نہ دی اور ملک کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ مسلم لیگ اپنے اعمال کی بدولت اپنی موت آپ ہی مر رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب اس مری شدہ لاش کو اپنے ہاتھوں دبا دیا جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ اس کی اور بھی بے حرمتی ہوگی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کو پارٹیوں کی لعنت سے قانوناً پاک کر دیا جائے۔ ملتِ اسلامیہ (دنیا میں) باطل کے مقابلہ میں، خود ایک پارٹی ہے۔ اس پارٹی کے اندر پارٹیاں بنانا ملت کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سازش کو کب تک روا رکھا جائے گا۔

ہماری جمہوریت فروری ۱۹۵۵ء سے ماہنامہ طلوعِ اسلام نے بلحت روزہ آرگن کی صورت اختیار کی۔ ۲۰ فروری

کی اشاعت میں اس نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں جو "جمہوریت اور پاکستان" کے عنوان سے شائع ہوا، دستور یہ کے اراکین کی "نمائندہ حیثیت" کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا۔

جہاں تک جمہوریت کے عملی تجربہ کا تعلق ہے اس کی زندہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہاں تشکیل پاکستان سے بھی پہلے ایک مجلس آئین ساز وجود میں آئی تھی جس کے متعلق لوگوں کو اب اتنا بھی یاد نہیں کہ اس کے ممبروں کو کس نے منتخب کیا تھا اور وہ کس طرح ایوان مجلس میں پہنچ گئے تھے۔ سات سال کے عرصے میں اسمبلی نے جو کچھ کر کے دکھایا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اس کے نام تک سے بیزار ہو چکے تھے۔ لوگ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ کسی طرح اس قابوس کو اپنے سینے سے ہٹا کر الگ کر دیں لیکن انہیں بتایا جاتا تھا کہ جمہوری مشینری کی رو سے تم ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ وہ حیران تھے کہ یہ کس قسم کی جمہوریت ہے جس میں ہم ایک شخص کو نمائندہ تو بنا سکتے ہیں لیکن جب ہمیں اس پر اعتماد نہ رہے تو اپنی نمائندگی سے الگ نہیں کر سکتے! وہ پوچھتے تھے ان سے جن سے وہ پوچھ سکتے تھے کہ تم تو کہتے تھے کہ جمہوریت کے معنی ہیں "عوام کی منشا کے مطابق حکومت" لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ عوام چیخ رہے ہیں اور یہاں ان کی کوئی سنتا ہی نہیں! لیکن اس کے باوجود ان سے کہا یہی جاتا ہے کہ نہیں! یہ اسمبلی تمہاری منشا کے مطابق قائم ہے۔ اس کے ممبر تمہارے صحیح نمائندے ہیں۔ اس کا مرتب کردہ آئین، خود تمہارا بنایا ہوا آئین سمجھا جائے گا۔ تمہیں اپنے بنائے ہوئے زندان میں محبوس رہنا پڑے گا۔

(شمارہ ۶ ؍ فروری ۱۹۵۵ء ـ صـ۴)

اور پھر اس نے صورتِ حال کی اصلاح کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے ہاں کی جمہوری مشینری میں اس قسم کی گنجائش کا رکھنا نہایت ضروری ہے کہ اگر کسی وقت بھی یہ دیکھا جائے کہ قوم کے نمائندے ملت کے مفاد کا تحفظ اور قوم کی صحیح نمائندگی نہیں کر رہے تو انہیں بلا دقت ان کی کرسیوں سے الگ کر کے ان کی جگہ دوسرے نمائندے لائے جا سکیں۔

(ایضاً)

مجرم کون؟

کراچی کی پولیس نے ایک تیس سالہ نوجوان کو خودکشی کے جرم میں گرفتار کیا۔ "مجرم کون ہے" کے عنوان سے طلوعِ اسلام نے زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے پہلے یہ لکھا کہ پولیس کا فریضہ یہی تھا کہ اس نوجوان کو گرفتار کرے اور اب عدالت کا فریضہ بھی یہی ہے کہ اسے سزا دے۔ اس پر لکھتے ہوئے اس نے مدیر

کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب وقت یہ نوجوان شہر میں مارا مارا پھرتا تھا کہ اسے کوئی روزگار مل جائے اور اسے روزگار نہیں ملتا تھا جس وقت وہ سارے دن کی دوڑ دھوپ کے باوجود بھوکے پیٹ کوئی چھت تلاش کرتا تھا کہ جس کے نیچے وہ رات بسر کر سکے۔ تو کیا اس وقت بھی کسی کا فریضہ تھا یا نہیں کہ اس کے لئے روزگار مہیا کرے؟ روزگار نہیں ملتا تو اس کے کھانے کے لئے روٹی اور رہنے کے لئے مکان کا انتظام کرے۔ اس وقت اس چودہ پندرہ لاکھ کی بھری بستی میں اس کی مصیبت میں اس کا ہاتھ بٹائے اور اس کی پریشانی میں اس کا ساتھ دے سکے۔ لیکن جب اس نے تنگ آکر گھر ماری تو بہت سے فرائض بیدار ہو گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اقدام خودکشی جرم ہے لیکن (مذکورہ صدر حالات میں) خودکشی کرنے والا اس جرم کا اتنا ذمہ دار نہیں جتنا ذمہ دار وہ معاشرہ ہے جو اسے اس اقدام پر مجبور کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ فطرت کے اٹل قوانین (جو عدل کی صحیح بنیادوں پر قائم ہیں) اس فرد کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو سزا کا مستوجب قرار دیتے ہیں ...... اور آپ کو معلوم ہے کہ فطرت کی عدالت سے اس جرم کی سزا کیا ملا کرتی ہے؟ وہ ان تمام خوشحالیوں کو چھین لیا کرتی ہے جو اس نے عطا کر رکھی ہوں (بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۶۷/۲۷) اور آسمان کی بلندیوں پر اڑنے والوں کو زمین کی پستیوں میں دھکیل دیا کرتی ہے (جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ۱۱/۸۲)

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(شمارہ ۵ مارچ ۱۹۵۸ء — صفحہ ۵۰)

دفتری نظام

ایک مملکت کے کاروبار میں دفتری نظام کو بڑی بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جہاں دفتری نظام بدنظمیوں اور بدعنوانیوں کا شکار ہو وہاں مملکت کے عوام کی پریشانیوں کی کیا کیفیت ہوگی اور خود نظام مملکت پر اس کا کیا اثر پڑے گا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ پاکستان اسی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ چنانچہ "دفتری بدنظمیاں" کے عنوان سے طلوعِ اسلام نے اس موضوع پر اپنے مقالہ افتتاحیہ میں قلم اٹھایا اور لکھا۔

اگر ہم مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں اپنی حکومت (پاکستان) کے دفاتر کو دیکھتے ہیں تو بلاخوف کہنا پڑتا ہے کہ ان کی حالت سکھوں کی ان ریاستوں سے بھی بدتر ہو چکی ہے جنہیں تقسیم سے پہلے

بدتلقی کے لئے بطور ضرب المثل پیش کیا جاتا تھا۔ ہم یہ بات محض سنی سنائی نہیں کہہ رہے بلکہ بہتوں کے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، دفاتر میں اہلکار اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ وہ عوام کی ضروریات کو پورا کرنے اور ان کے معاملات کو سلجھانے میں ان کی معاونت کریں۔ لیکن ہمارے دفاتر میں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں یہاں حاکم کی حیثیت سے ہوں اور میرا کام یہ ہے کہ پبلک کا جو آدمی میرے پاس آئے اس پر حکومت کروں۔ چنانچہ آپ کسی دفتر میں جائیے، سب سے پہلے آپ کو اسی "تھانیدارانہ" ذہنیت سے واسطہ پڑے گا۔

(شمارہ طلوع اسلام بابت ۱۹ مارچ ۱۹۵۵ء — ص۳)

اس کے بعد وہ ارباب حکومت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور لکھتا ہے!۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت حالات کی اہمیت کا کسی کو اندازہ نہیں اور ان کی اصلاح کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ ہمارے ارباب بست وکشاد "بڑے بڑے مسائل" کے سلجھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں لیکن نہیں سمجھتے کہ ان مسائل کے سلجھانے میں تگ و تاز کرنے کا کچھ فائدہ نہیں، اگر افراد مملکت کے معاملات پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جائیں اور انہیں نہ ضروریات زندگی کی طرف سے آرام نصیب ہو، نہ قلبی و ذہنی احتیاجات کی طرف سے اطمینان۔ یاد رکھئے! اچھی حکومت وہی ہے جس کے دفاتر اچھے ہوں اور دفاتر وہی اچھے ہوتے ہیں جو عوام کی ضروریات پوری کرنے اور ان کے معاملات سلجھانے میں ہر قسم کی مدد دینا اپنا سرکاری فریضہ سمجھیں۔ اور سمجھیں ہی نہیں بلکہ اس فریضہ کو ادا بھی کریں۔ اگر ہمارے دفاتر میں یہ تبدیلی نہ ہوئی تو حکومت بھی محکم بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے کہ

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

(ایضاً — ص۳)

مشرقی پاکستان میں مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق کی برطرفی کے بعد جب وزیر اعظم محمد علی دوبارہ ڈھاکہ گئے تاکہ مولوی صاحب سے مفاہمت کرکے انہیں دوبارہ وزارت سونپ دیں تو اس پر ایک شذرہ سپرد قلم کرتے ہوئے طلوع اسلام نے تحریر کیا کہ

جہاں تک مولوی فضل الحق کی حمایت کا تعلق ہے یہ روش بڑی افسوس ناک ہے۔ تعجب ہے کہ وہی وزیر اعظم اس کے مرتکب ہو رہے ہیں جنہوں نے نہ صرف مولوی صاحب کو غدار کہا

تھا بلکہ دلائل و شواہد سے غدار ثابت کیا تھا۔ جب سے وزیر اعظم نے مولوی صاحب پر یہ الزام لگایا ہے اس وقت سے لے کر اب تک مولوی صاحب کے رویہ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی جس سے ظاہر ہو کہ انھوں نے ماضی سے توبہ کرلی ہے یا وہ آئندہ غدارانہ حرکات سے مجتنب رہیں گے۔ جو کچھ وزیر اعظم نے مولوی صاحب کے متعلق فرمایا تھا اس کا عشر عشیر بھی کسی عام شہری سے متعلق ہوتا تو وہ یقیناً عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوتا لیکن مولوی صاحب سے باز پرس کرنا تو درکنار انھیں پھر سے وزیر اعلیٰ بنایا جا رہا ہے۔

(شمارہ اسلام بابت ۲۶ مارچ ۱۹۵۵ء — صفحہ)

اور اس کے ساتھ ہی ایسے غلط اقدام کے خطرناک نتائج سے خبردار کرتے ہوئے اس نے لکھا۔

مولوی فضل الحق کی بحالی کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں جسے یونہی نظرانداز کر دیا جائے۔ ان کی ساٹھ دنوں کی حکومت میں مشرقی پاکستان کا دامنِ امن و امان ہی تباہ نہیں ہوا تھا بلکہ پاکستان کے حصے بخرے ہو جانے کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔ اگر جسارت سے کام لے کر انھیں بروقت گدی سے اتار نہ دیا گیا ہوتا تو ملک کے لئے بڑے خوفناک نتائج نکلتے ...... اگر مصلحتِ وقت کا تقاضا پارلیمانی احیا ہی ہے تو اس کے لئے یہ کہاں سے لازم آتا ہے کہ آدھے سے زیادہ پاکستان کو ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیا جائے جسے خود وزیر اعظم غدار قرار دے چکے ہیں اور ملک اسے بالعموم غدار سمجھتا ہے۔

(ایضاً)

درویشوں سے استمداد

مشرقی پاکستان میں پارلیمانی زندگی کی بحالی کے سلسلے میں جب وزیر اعظم محمد علی ڈھاکہ میں تھے تو اخباری اطلاعات کے مطابق انھوں نے وہاں ایک درویش سے خفیہ ملاقات کی اور انہیں ڈھاکہ سے شاہانہ اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ ایک عظیم مملکت کا وزیر اعظم اور درویشوں سے "برائے استمداد" خفیہ ملاقاتیں! طلوعِ اسلام کو لکھنا پڑا کہ

اس سے پہلے اتنا ہی سنا تھا کہ بڑے بڑے لوگ سٹہ کا نمبر معلوم کرنے کے لئے فقیروں کے ہاں جاتے ہیں لیکن اب معلوم ہوا کہ معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا ہے اور اب امورِ سلطنت کے لئے بھی ان بارگاہوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اب حافظؔ کو یہ شکایت نہیں رہے گی کہ

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا! مخروش

تاریخ شاہد ہے کہ جب حکومتوں کے فیصلے خانقاہوں سے ہونے لگے تو سلطنتیں مٹنا شروع ہو گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خانقاہوں کی طرف جاتا ہی اس وقت ہے جب وہ عمل سے بیگانہ اور جد و جہد کے نتائج سے مایوس ہو جاتا ہے۔ بہرحال اب بھی اگر کسی کو مملکت پاکستان کے "اسلامی" ہونے میں شبہ ہو تو اس کا کچھ علاج نہیں۔ ابھی تو ابتدا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

(شمارہ ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء — صفحہ ۱۲)

جب تک
مرض کی صحیح تشخیص

نہ ہو اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ایک نامور حکیم بدوڑ نے مدت العمر کی تحقیق کے بعد معلوم کیا کہ

اسبابِ زوالِ اُمت

کیا ہیں۔ اس کتاب نے لوگوں کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے متعدد ایڈیشن پہلے شائع ہوئے۔ اب جدید ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد "مستند ایڈیشن" کے طور پر شائع ہو گیا ہے۔ اس کے ہزاروں کی تعداد میں آرڈر پہلے سے بک ہو چکے ہیں ——— آپ بھی اپنی فرمائش بھیج دیں تاکہ مزید انتظار نہ کرنا پڑے۔

قتلِ مرتد اور غلام لونڈیاں

جیسے اہم عنوانات پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جو مدت سے نایاب تھی۔ اس کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ اب یہ مصنف کی نظر ثانی کے بعد "مستند ایڈیشن" کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوگی۔ جلد فرمائش بھیجیے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ ——— لاہور

اسلام اور علومِ حاضرہ

(نواب محسن الملک مرحوم)

[اس مقالہ کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت کی روشنی میں کیجئے کہ آج سے قریب سو سال پہلے لکھا گیا تھا ——— طلوع اسلام]

اکثر مسلمان مذہبی باتوں میں عقل کو دخل دینے یا مذہبی مسائل کو علم اور فطرت سے مطابق کرنے میں تعجب کرتے ہیں اور جو لوگ معقول و منقول یا مذہب و فطرت کی تطبیق میں کوشش کرتے ہیں، ان کو مذہب کا حامی سمجھنے کے بجائے مذہب کا دشمن جانتے ہیں اور ایسے لوگوں کی کوششوں پر حیرت زدہ ہو کر پوچھتے ہیں کہ کیا خدا اور رسول کے فرمانے کے بعد حقیقت اور سچائی کے دریافت کرنے کی کچھ ضرورت باقی رہتی ہے۔ یا خدا اور رسول کے کلام کی تصدیق کے لئے کسی علم اور فطرت کی ضرورت ہے۔ ایسی ضرورت کا خیال کرنا خود دین میں شک کرنا ہے اور شک بیدینی اور کفر کا پہلا زینہ ہے۔ اس زمانہ میں یہ اعتراض زیادہ تر سید صاحب[1] پر کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے مذہب کو فطرت سے ملانے کا مشکل کام اپنے ذمہ لیا ہے اور ان کی تفسیر اور دیگر مذہبی مضامین بہت تعجب اور افسوس سے دیکھے جاتے ہیں اور مجھے جب سے کہ میں نے ان کی تفسیر کے متعلق لکھنے کا ارادہ کیا ہے لوگ ان کا مخالف سمجھتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چند لفظوں میں مذہب کو علم سے مطابق کرنے کی ضرورت اور جو فرق میرے اور سید صاحب کے خیالات میں ہے اس کی کیفیت بیان کروں

جو لوگ مذہب کو صرف مذہبی دلائل اور مذہبی اسناد سے جانچتے ہیں بلکہ وہ لوگ جو مذہبی مسائل میں

---

[1] سر سید احمد خان مرحوم

دلیل اور سند کا خیال تک نہیں کرتے، بلاشبہ ان کے عقائد نہایت مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں اور جہالت ان کے دین کی بڑی محافظ ہوتی ہے مگر ایسے عقائد درحقیقت رسمی اور تقلیدی ہوتے ہیں اور گو ایک جاہل شخص کے لئے درصورتیکہ پیدا ہونے اس مذہب کے جس کو وہ مانتا ہے، بلحاظ نتیجہ مفید ہوں، مگر ایسا شخص نہ اپنے مذہب کی اشاعت کر سکتا نہ دوسروں کو اپنے مذہب کی دعوت دے سکتا ہے، ایسا شخص غالباً ناجی ہو مگر ہادی اور حامیٔ دین نہیں بن سکتا اور مذہب اسلام چونکہ تمام دنیا کے لئے ہے اور ہر قسم اور ہر درجہ اور طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی ہم مسلمانوں پر فرض ہے، اس لئے اسلام کی اشاعت کی خواہش رکھنے والے مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مختلف خیالات کے لوگوں کے موافق ان کو اسلام کی دعوت دے اور موجودہ زمانہ کی حالت دیکھ کر اسلام کی حقیقت ثابت کرے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو جب خدا نے ہدایت کے لئے مامور فرمایا تو صرف ایک ہی طریقہ پر اسلام کی طرف بلانے کا حکم نہیں دیا بلکہ ہر شخص کے خیال اور حالت کے موافق جدا جدا طور سے دعوت کرنے کے طریقے بتائے اور ایک آیت میں اس کو بیان کر دیا وہ آیت یہ ہے۔

"ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن"

یعنی اپنے پروردگار کی راہ پر لوگوں کو حکمت سے یا اچھی نصیحت سے بلانا چاہیئے اور جو لوگ کہ جھگڑالو ہیں ان کو انہیں کے طور پر اچھی طرح سمجھانا چاہیئے۔ پس خدا کے اس ارشاد کے موافق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت اور موعظت اور مجادلہ تینوں طریقوں سے دعوت اسلام کے

اصول قائم کئے اور تینوں قسم کے آدمیوں کی سمجھ کے موافق خدا نے اپنا کلام نازل فرمایا اور اپنے کلام معجز نظام میں ہر چیز کو اس طور پر بیان کیا کہ ہر شخص اپنے اپنے خیال و مذاق کے موافق اس سے مستفید ہو سکے۔ انہی اصول کو حامیانِ دین اور حامیانِ ملت نے ہمیشہ پیش نظر رکھا اور ہر زمانہ کے خیالات کے موافق قرآن کے معنی بیان کئے۔ جس زمانہ میں علم کا چرچا نہ تھا اور لوگوں کے دل علمی خیالات سے صاف تھے، ان کو انہی کے خیال کے موافق ظاہری باتوں سے سمجھانے پر قناعت کی۔ جب کہ وہ زمانہ آیا جس میں حکمت و فلسفہ کا چرچا ہوا۔ یونانی علوم شائع ہوئے، اس وقت حکمائے اسلام نے خدا کی تعلیم کے موافق علم و حکمت سے کام لیا اور عالموں اور حکیموں کو علم و حکمت سے سمجھانا شروع کیا اور خدا کے کلام کے دقائق اور حقائق اور نکات و اسرار بیان کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور مذہب اسلام کو علم و حکمت کے مطابق ہونا ثابت کیا۔ اگر بزرگانِ دین پہلے ہی طریقوں پر قائم رہتے، اور فلسفہ جاننے والوں کو عرب و حجاز کے بدویوں اور حامیوں کی طرح ظاہری باتوں کے سمجھانے پر کفایت کرتے تو غالباً بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا اور اسلام ان کی نگاہوں میں جہالت کا مجموعہ سمجھا جاتا۔ جس زمانہ میں جو ترقی علم و سائنس نے کی

ہے اور جو خوفناک اثر اس کا مذہب پر ہو رہا ہے وہ گزشتہ سے بہت زیادہ ہے، اور اس زمانہ میں مذہب و علم کی تطبیق کی ضرورت اس زمانہ سے بڑھکر ہے۔ جو لوگ اس زمانہ کی علمی ترقیوں سے بے خبر ہیں ان کو اس کی ضرورت اور جو مشکلات اس کام میں اس وقت درپیش ہیں ان کا سمجھنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام کی حمایت صرف اسی ایک بات پر منحصر ہے کہ اس کا سائنس و فطرت کے مطابق ہونا ثابت کیا جائے مگر اس زمانے میں اس طرح پر حمایت اسلام کی بہ نسبت گزشتہ زمانہ کے نہایت مشکل ہے۔ اگلے زمانہ میں گو فلسفہ و حکمت نے ترقی کی تھی مگر اس وقت علم محدود اور نظری تھا۔ مسائل اس کے مشتبہ اور موہوم تھے اس زمانہ کے فلسفہ کا رجحان روحانیت کی طرف تھا۔ جس کو مذہب سے ایک نوع کی مناسبت تھی۔ علاوہ بریں، مذہب کی حمایت کے لئے حکومت موجود تھی۔ اس لئے مذہبی عقائد کو علم کا چنداں خوف نہ تھا اور ان کی حفاظت زیادہ مشکل نہ تھی۔ اسلام کا بہت بڑا وسیع دائرہ، علم کے صدمے سے اس لئے محفوظ رہتا تھا کہ علم کی رسائی وہاں تک ہو ہی نہ سکتی تھی، اور وہ چھوٹا حلقہ جہاں حکمت و فلسفہ کا گذر ہوتا خود علمی مسائل کے غیر محقق ہونے سے کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کر لیتا تھا۔ اس پر بھی اگر مذہب و علم میں جھگڑا ہوتا تو مذہب کی حمایت کے لئے ایسے سامان اور ذریعے تھے کہ علم کو پیچھے ہٹنے کے سوا دوسرا چارہ نہ تھا۔ علم مذہب کے مقابلے سے کبھی یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا کہ یہ خدا کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے اس کا فاش کرنا ممنوع ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی نہ مانتا تو خدا کی زمین ایسے ملحد کے وجود سے پاک کر دی جاتی۔ مگر اس زمانہ میں نہ علم محدود ہے اور نہ نظری و خیالی ہے۔ اور نہ حکومت اس کی مدد کے لئے موجود ہے۔ بلکہ اس کی حدود روز بروز وسیع ہوتی جاتی ہے۔ اس کی بنا مشاہدہ پر قائم ہو رہی ہے نہ مذہبی عقائد پر۔ بحث کرنے والے کی تسلی مکاشفہ سے ہو سکتی ہے نہ "ھذا سرّ من اسرار الربوبیۃ" کہہ کر کوئی روکا جا سکتا ہے اور نہ خدا کی پاک زمین شک کرنے والے کے نجس وجود سے پاک کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یا تو ہر مذہبی عقیدہ کی بنیاد علمی مسائل کی طرح تحقیق پر قائم کی جاوے، یا مذہب کو جس کی عمر طبعی غالباً قریب آ گئی ہے، اپنی حالت پر مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاوے۔ سائنس یعنی علم اب چند خانگی مدرسوں میں بند نہیں ہے۔ جہاں خاص لوگوں کے سوائے علم کو پہنچنا مشکل ہو۔ نہ وہ پاک کتابوں میں مقفل ہے جن کا کھولنا بجز مقدس ہاتھوں کے اوروں کو منع ہو۔ نہ وہ استعارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا سمجھنا مشکل ہو، نہ وہ ان اسرار الٰہی میں سے ہے جن کے لئے اب الہام اور کشف صدور کی ضرورت ہو، بلکہ سائنس اب تمام چیزوں سے آزاد ہے۔ اس نے اپنے سارے طوق و سلاسل توڑ دیئے ہیں۔ جو اصول فلسفیوں کے سینے میں بند تھے وہ اب بچوں کی زبان پر ہیں اور وہ باتیں جن کا زبان پر لانا مشکل اور منع تھا ان علانیہ نقل مجلس ہو رہی ہیں۔ علم اب نظری نہیں رہا کہ منطق کی بھول بھلیوں میں گھومتا رہے۔ بلکہ وہ اب آسان، دلپسند،

ہر دل عزیز اور زندگی میں داخل ہوگیا ہے۔ لیڈیاں علم پر کتابیں لکھتی ہیں، مدرسہ کے لڑکے ارسطو اور افلاطون کے فلسفے پر بحثیں کرتے ہیں۔ اخباروں میں علمی مباحثے چھپتے ہیں۔ قلی اور مزدور تک علمی باتیں سمجھتے ہیں۔ ہر روز ایک نئی تحقیق اور جدید انکشاف کی خبر آتی ہے۔ ہر رسالہ اور ہر پرچہ اور ہر خبر کے کاغذ میں کوئی نہ کوئی نئی بات نظر پڑتی ہے، غرضیکہ ان دنوں دلوں میں ایک نئی تحریک پیدا ہو رہی ہے۔ الہامی باتوں پر اعتقاد دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ تحکماء اور تقلیدی مذہب کا زور روز بروز گھٹ رہا ہے۔ مذہبی مسائل کے لئے علم کی سند مانگی جاتی ہے۔ کوئی چیز سوائے تحقیق کے مقدس اور پاک نہیں مانی جاتی ہے۔ یا دلیل اور ثبوت کے بغیر کسی بات کی سچائی دل میں نہیں بیٹھتی ہے۔ اب کوئی اسے بُرا سمجھے یا اس پر افسوس کرے، یا چند قطرے آنسو کے بہا دے۔ مگر زمانہ تحقیق اور علم کا ہے اور اس کا اثر روز بروز مذہب پر پڑتا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے حالات سے جن کو واقفیت ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مذہبی عقائد سے بہت کچھ انحراف ہوگیا ہے۔ دہریت اور لا ادریت وبا کی طرح پھیل رہی ہے مذہبی باتوں میں نہ صرف شک اور شبہے کئے جاتے ہیں، بلکہ بغیر کسی خوف یا شرم کے ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے دہریت کے شعلے ہر مقام پر بلند ہو رہے ہیں۔ چرچ اور گرجے جلتے، ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ ایسے نازک زمانے میں جو لوگ مذہب کی عاقلانہ حمایت کرنے والے ہیں، وہ مذہب کی بنیاد علم اور فطرت پر قائم اور دینی عقائد کو علم و فطرت کے مطابق ثابت کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی دنیا میں عموماً اور ہمارے ہندوستان میں خصوصاً نہ صرف الحاد اور دہریت کے پھیلنے کی مصیبت ہے بلکہ اب تک مذہب کی حمایت کا جیسی کہ اس زمانہ میں درکار ہے کسی کو خیال بھی نہیں ہے ان ملکوں میں جہاں اسلامی سلطنت اب تک قائم ہے، شاید دردوں اور فتووں سے کسی قدر مدد ملے، مگر مذہب جس کی بنیاد یقین پر ہے، وہ ان تدبیروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اور ہمارے یہاں تو یہ کاٹھ کا ہتھیار بھی نہیں ہے۔ نہ سوائے کفر کے فتووں کے مذہب کے بچانے کا کسی کے پاس کوئی اور ہتھیار ہے۔ اور کفر کے فتووں کا یہ حال ہے کہ پنساریوں کی پڑیوں میں کام آتے ہیں، یا اس سے پہلے کہ ان کے سیاہی خشک ہو، انہیں دیمک کھا لیتی ہے۔ ایسے زمانہ میں جو شخص مذہب کی حمایت علاقانہ طور پر کرے، اور مذہبی عقائد کو قوانین قدرت سے ملانے میں ساعی ہو وہ درحقیقت نہ صرف سچا مومن اور پکا دین دار ہے بلکہ مجاہد فی سبیل اللہ اور جہاد اکبر کے ثواب اور تمام مسلمانوں کی شکرگذاری کا مستحق ہے۔ اور چونکہ سید صاحب نے یہ بڑا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ اور اس جہاد اکبر کا جھنڈا اٹھایا ہے۔ اس لئے اسلام ان کا شکرگذار ہے اور تمام مسلمانوں پر ان کا احسان ہے۔ رہا یہ امر کہ یہاں تک وہ اس میں کامیاب ہوئے اور ہو سکتے ہیں، اس کا ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ ادنیٰ جہاد کے لئے بھی اعوان و انصار کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر ایک آدمی گو کیسا ہی بہادر اور تجربہ کار ہو تن تنہا کامیاب نہیں

ہو سکتا۔ اکیلے ان سے ایسے بڑے جہاد میں کامیاب ہونے کی کون امید کر سکتا ہے۔ ان سے غلطیاں بھی ہوں گی، ان کی رائیں خطائیں بھی کریں گی، مگر چونکہ نیت ان کی نیک اور خالصاً للہ ہے، اس لئے ان کی غلطی بھی دوسروں کے صواب سے بہتر ہے۔ میں تو ان کے اس ارادہ ہی کی تعریف کرتا۔ اور اپنے آپ کو ان کے انصار اور اعوان میں سمجھتا ہوں، میں نے ان کی تفسیر کی نسبت جو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ درحقیقت ایک طرح پر ان کی مدد اور متابعت ہے نہ مخالفت۔

میں اس امر میں بالکل ان سے متفق ہوں کہ مذہبی مسائل علمی نظر سے دیکھے جائیں اور جس طرح علمی مسائل کی نکتہ چینی کی جاتی ہے، مذہبی مسائل کی بھی اسی طرح تحقیق کی جائے اور مذہب کا فطرت کے مطابق ہونا (جیسا کہ درحقیقت وہ ہے) ثابت کیا جاوے۔ یہی سچی حمایت اسلام کی ہے اور یہی طریقہ اسلام کی حفاظت کا ہے۔ جو لوگ مذہب کی صرف مذہبی دلائل سے تائید کرتے ہیں اور سائنس کی محققہ مسائل کو بیہودہ اور خیالی دلیلوں سے غلط کہتے ہیں، وہ میرے نزدیک اسلام کے حامی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے نادان دوست اور درحقیقت دشمن ہیں۔ میری مخالفت سید صاحب سے اس لئے نہیں ہے کہ جو اصول مذہب کی تطبیق کا فطرت سے انہوں نے اختیار کیا ہے اسے میں غلط جانتا ہوں یا قوانین فطرت کو قابل تبدیل سمجھتا ہوں بلکہ میرا اختلاف صرف اس میں ہے کہ جن باتوں کو وہ قانونِ قدرت سے خارج سمجھتے ہیں میرے نزدیک وہ قانونِ قدرت میں داخل ہیں اور اسی امر کو میں اپنی آئندہ تحریروں میں دکھانا چاہتا ہوں۔ فقط۔

(بشکریہ تہذیب الاخلاق لاہور۔ بابت اگست ۶۲ء)

صحیح اسلام سمجھنے کے لئے پرویز صاحب کا
لٹریچر دیکھئے۔ اس کی تفصیل کیلئے ایک کارڈ ذیل کے پتہ پر بھیج دیجئے۔
میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ
۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

رابطۂ باہمی

بزم ہائے طلوع اسلام کی ماہانہ رپورٹیں

لاہور عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید منانے کے لئے مقامی بزم نے شایانِ شان پروگرام مرتب کیا۔ اس پروگرام کا آغاز اس عظیم الشان اجتماع سے ہوا جو ۱۲۔ اگست کی صبح کو ۲۵۔ بی گلبرگ میں انعقاد پذیر ہوا۔ مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب اس اجتماع سے خطاب کر رہے تھے اور ان کے خطاب کا موضوع تھا ــــ "شہنشاہِ بوریا نشینؐ"۔ اخبارات اور پوسٹروں کے ذریعہ اس خطاب کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ اور مقامِ اجتماع پر متوقع حاضری کے پیشِ نظر زیادہ سے زیادہ نشستوں کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ لیکن مقررہ وقت سے بہت قبل تمام نشستیں حاضرین سے پُر ہو گئیں۔ جس کے بعد مزید حاضرین کے لئے دریوں کا انتظام کیا گیا لیکن حاضرین کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

ٹھیک سوا نو بجے پرویز صاحب کا وہ بصیرت افروز خطاب شروع ہوا جو حضورِ رسالت مآبؐ کی سیرۃ طیبہ کے ایک اہم ترین گوشے کو شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان بنا رہا تھا ــــ پرویز صاحب اپنے مخصوص حسنِ بیان کی وجد آفرینیوں میں بتا رہے تھے کہ ایک صدرِ مملکت کی حیثیت سے حضورؐ نے کس قسم کا بے مثال معاشرہ قائم کیا اور اپنے اسوۂ حسنہ سے آنے والی نسلوں کے لئے کیسے کیسے نشانات قائم کئے ــــ حضورؐ کی سیرۃ طیبہ کا یہ گوشہ پرویز صاحب کے عالم آرا قرآنی مشن میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جب وہ اس موضوع کی تفصیلات، اصحابِ علم و فکر سے آراستہ مجلس کے سامنے لا رہے تھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا حقائق و معارف کی ایک جوئے نور عراقِ دل نشین کی ساز پر نغمے الاپتی مستانہ وار رواں دواں ہے۔ وہ پہلے

قرآن کی ایک آیت سامنے لاتے اور پھر عہدِ رسالتمآبؐ کی تاریخ سے رفتارِ زمانہ کے نقاب اٹھاتے ہوئے حضورؐ کے اس مثالی کردار کی حسین تصویریں پیش کرتے چلے جاتے جس کا نقشِ ثانی پھر کبھی آسمان کی نگاہیں نہ دیکھ سکیں۔

پرویز صاحب نے تفصیلاً بتایا کہ کس طرح نبی اکرمؐ نے سرزمین حجاز میں ایک مملکت قائم کی۔ اس مملکت کا نظام ہاتھ میں لیا اور ایک صدرِ مملکت کا منصب اختیار کر کے تاریخِ انسانی کو ایک مثالی نظام عطا کیا۔ اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ نے شہنشاہی میں فقیرانہ انداز اختیار کر کے دنیا کو بتایا کہ تاریخِ انسانی میں ایسا بے مثال معاشرہ قائم کرنے کے لئے اس کے موسسِ اول کو کس قسم کا اسوۂ حسنہ پیش کرنا چاہیئے۔ پرویز صاحب نے بتایا کہ حضورؐ نے یہ فقیرانہ انداز اس لئے اختیار نہیں کیا تھا کہ آپ ایک تارک الدنیا راہب کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ یہ اس لئے تھا کہ اسلامی مملکت کے ذمہ ربوبیتِ عامہ کا جو عظیم فریضہ عائد ہوتا ہے، اس کا تقاضا اس قسم کی زندگی تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

بوریا ممنونِ خواب راحتش !

تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش !!

پرویز صاحب کا یہ بصیرت آفریں خطاب ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔ اور جب وہ اختتام پذیر ہوا تو حاضرین کے قلب و نگاہ میں، شہنشاہ بوریا نشینؐ کی سیرۃ طیبہ کے حسین ترین نقوش جگمگا رہے تھے۔

۲۔ بزم طلوع اسلام نے اس تقریبِ سعید کے سلسلے میں اسی رات ۲۵۔ بی گلبرگ میں ایک مجلسِ احباب اور عشائیہ کا بھی اہتمام کر رکھا تھا۔ ادارہ طلوع اسلام کا دفتر اور مفکرِ قرآن کی قیام گاہ رنگا رنگ کے برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ اور نور و نکہت کی اس فضا میں بزم کے ارکان اور شہر کے دیگر معززین یہاں جمع تھے۔ عشائیہ کے بعد ایک محفلِ سرود منعقد ہوئی۔ جس میں اقبالؒ کے شہ پاروں سے حاضرین کی دلنوازی کا سامان مہیا گیا۔ اس یادگار مہتابی رات میں گلبرگ کی یہ شاداب فضا برقی قمقموں سے نور افشاں تھی۔ قرآنی نظام کے طائرانِ پیش رس سینوں میں نئی منزلوں کی بے تابیاں لئے جمع تھے۔ نغمۂ قرآنی میں اقبالؒ کے نغموں نے فردوسِ گوش کا سماں باندھ رکھا تھا۔ ستاروں کی انجمن اپنی رفعت سے اس یادگار مجلس کی دلکشائیوں میں محو تھی۔ اور ان کی چشمکوں میں یہ آرزو تڑپ رہی تھی کہ یہ پُر نشاط مجلس کبھی ختم نہ ہو اور نہ یہ سہانی رات۔

کوئٹہ بزم گزشتہ دو ماہ میں اپنی رپورٹ نہیں بھیج سکی لیکن رپورٹ کی ترسیل میں اس سستی کا یہ مطلب نہیں کہ بزم عملی طور پر بھی سست واقع ہوئی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا کام پورے جوش و خروش سے ہو رہا ہے۔ اور اس کے نتائج انتہائی امید افزا ہیں۔ ہفتہ وار اجتماعات میں مفہوم القرآن اور لغات القرآن کی روشنی میں قرآن کریم کا درس جاری ہے۔ پرویز صاحب کے اہم خطابات بھی پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ تجربہ کے طور پر بزم نے حال ہی میں ایک اجتماع وحدت کالونی میں کیا۔ اس تجربہ کے شاندار نتائج کے پیشِ نظر شہر کے دیگر حصوں میں بھی ایسے اجتماعات کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ بہت سے حضرات تلاشِ حقیقت کی ایک تڑپ سی دلوں میں لئے ہوئے بزم کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں اور تسکینِ قلب کا سرمایہ لے کر واپس لوٹتے ہیں۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں محترم حسن عباس رضوی کے جو مضامین مختلف جرائد میں شائع ہوئے ہیں بزم ان کے خوش آیند نتائج پر فخر کر سکتی ہے۔ اور دیگر بزموں کو بھی اس ضرورت پر متوجہ کرتی ہے۔ ملکی جرائد کے ذریعے قرآنی افکار کی روشنی میں پھیلانے کی کوششیں ملک کے ہر گوشے سے جاری ہونی چاہئیں۔ اس سے پاکستان کے ہر مسلمان کو ایک نئی زندگی نصیب ہوگی۔

کوئٹہ کے سالانہ جشن میں لٹریچر کی تقسیم کا پروگرام طے کر لیا گیا ہے اور سالہائے ماسبق کی طرح اس سے انتہائی خوشگوار نتائج سامنے آئیں گے۔

مری احباب کے اجتماعات مختلف مقامات پر جاری ہیں اور بڑے ذوق و شوق اور خلوص و محبت کے آئینہ دار ان اجتماعات میں خدا کی کتاب اور اس کا پیش کردہ نظامِ فکر و تدبّر کا محور ہوتا ہے۔ سب کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد ہے کہ سیاسی نعرہ بازیوں اور ہنگامہ خیزیوں سے بالاتر رہ کر دینی ارتقاء و تعمیر کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ عائلی قوانین کے پمفلٹ کی تقسیم بڑی کامیاب ثابت ہوئی ہے اور اس کے اثرات قابلِ استحسان۔ "نذرِ عقیدت بحضور رسالت مآبؐ" بڑا کشش انگیز پمفلٹ ہے۔ میلاد النبی کی تقریب سعید پر اسے تقسیم کیا گیا۔ یہ ان بہت سی جھوٹی افواہوں کا دو ٹوک جواب ثابت ہوا ہے جو مخالفین آئے دن پھیلاتے رہتے ہیں۔

پشاور صدر بزم کے اجتماعات ہر جمعہ کو باقاعدگی سے منعقد ہوتے رہے۔ صدر اور شہر کی بزموں کے مشترکہ اجتماع میں مرزا علی احمد خان صاحب اور دیگر احباب کے پُر اثر خطابات نے اس جمود کو توڑ دیا ہے جو بزم پر چھایا ہوا تھا۔ احباب اب نیا عزم لے کر آگے بڑھے ہیں۔ ماسٹر بدر الدین از سرِ نو نمائندہ منتخب ہوئے

ہیں۔ ماسٹر قمرالدین صاحب کو سیکرٹری اور محترم ثناء اللہ صاحب جاوید کو خازن مقرر کیا گیا ہے محترم پرویز صاحب کے درس قرآن کے ٹیپ بھی اجتماعات میں سنائے جاتے ہیں اور اراکین بزم کے علاوہ دیگر اہل علم حضرات بھی ان سے مستفید ہوتے ہیں

میانوالی بزم کے زیر اہتمام ۔ چوک مظفر خاں میں دارالمطالعہ افکار نو " کا افتتاح ہو گیا ہے اور اس میں قرآنی فکر و نظام کی تفصیلات سے متعلق تمام ضروری لٹریچر کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ انگریزی و اردو اخبارات بھی موجود رہتے ہیں اور مطالعہ کے لئے اہل ذوق جوق در جوق تشریف لا رہے ہیں۔ یہاں باہمی تبادلۂ خیالات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ دارالمطالعہ کی رسم افتتاح پر متعدد معززین شہر نے شرکت فرمائی دارالمطالعہ کے ساتھ مہمانوں کے قیام کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے۔

"عائلی قوانین" اور "نذر عقیدت" کے پمفلٹ ایک منظم پروگرام کے تحت تقسیم کئے گئے اور ان کی بدولت بڑے خوشگوار اثرات سامنے آئے ہیں۔

سیالکوٹ بزم کا ہفتہ وار اجتماع ہر جمعہ کو باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ ہر اجلاس میں گزشتہ ہفتہ کی کارگزاریوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پمفلٹ تقسیم کئے جا رہے ہیں "اسباب زوال امت" کی تقسیم بڑی موثر ثابت ہوئی ہے۔ احباب بڑے عزم و استقلال سے اپنے قدم آگے بڑھا رہے ہیں۔

بوریوالہ بزم کے اجلاس باقاعدگی سے جاری ہیں۔ درس قرآن کریم کا سلسلہ پانچویں پارے سے آگے بڑھ کر چھٹے پارے تک پہنچ گیا ہے۔ "عائلی قوانین" اور "نذر عقیدت" ہر دو پمفلٹس کافی تعداد میں تقسیم کئے گئے کنونشن نمبر کی کاپیاں بھی برائے مطالعہ تقسیم کی گئیں۔ اہل علم و فکر طبقہ میں اس اشاعت و تبلیغ کے اثرات بڑی خوش آیند فضا پیدا کر رہے ہیں۔ شمارہ اگست کے لمعات کی عام اشاعت کی گئی اور اس میں جس خطرے کی نشان دہی کی گئی ہے اسے ہر صاحب فکر نے بجا طور پر محسوس کیا۔ یہاں کا دیہاتی طبقہ تک اب اسے محسوس کر رہا ہے کہ جب تک مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کی شدت قائم ہے اس وقت تک اسلامی قانون سازی کی طرف کوئی قدم بھی کامیابی سے نہیں اٹھ سکے گا۔

راولپنڈی اب جب کہ راولپنڈی کو مملکت کے مرکزی مقام کا درجہ حاصل ہو رہا ہے۔ مقامی بزم تقاضائے حالات سے شایانِ شان طور پر عہدہ برآ ہو رہی ہے۔ مختلف اجتماعات میں پرویز صاحب کے اہم خطابات بذریعہ ٹیپ سنائے جاتے ہیں اور ان سے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہو رہے ہیں نمائندہ بزم کی طرف سے ہر اتوار کو واہ کینٹ کے اجتماع میں بھی ان تقاریر کو بذریعہ ٹیپ نشر کرنے کا انتظام

کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کی زندگی بخش آواز اب راولپنڈی کے علاوہ واہ کینٹ کی مجلسوں میں بھی فردوس گوش بن رہی ہے۔

لائل پور بزم کے نمایندہ محترم افتخار عالم صاحب اپنا کاروبار کسی دوسرے شہر میں منتقل کر رہے ہیں اور شہر چھوڑ جانے کے باعث ان کے لئے ممکن نہیں ہوگا کہ بزم کی نمایندگی کے فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ چنانچہ اب یہ ذمہ داری خان عبدالمجید خاں کے سپرد ہوئی ہے۔ بزم کے یہ نئے نمایندے نہایت خلوص اور ذوق سے اپنے کام میں لگ گئے ہیں۔ "عائلی قوانین" اور "نذر عقیدت" کے پمفلٹوں کی تقسیم کا کام انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سرانجام دیا اور معززین شہر کے ہاں پہنچ کر پمفلٹ تقسیم کئے ہیں۔

ڈیرہ غازیخاں بزم از سرِ نو سرگرم عمل ہے۔ ہر جمعہ کی شام کو بزم کے دارالمطالعہ میں درس قرآن کا انتظام کیا گیا ہے میلاد النبیؐ کی تقریب سعید پر "نذر عقیدت" اور دیگر پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔

بزموں کے نام ضروری ہدایات

یوں تو طلوع اسلام کا پیمستقل مسلک ہے کہ کسی سیاسی ہنگامہ میں حصہ نہ لیا جائے۔ لیکن ملک کی موجودہ فضا کے پیش نظر ان ہدایات کا دُہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) بزم طلوع اسلام کا کوئی رکن کسی سیاسی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی کوئی ایسا اقدام کر سکتا ہے جس سے کسی قسم کا فرقہ دارانہ اثر پیدا ہو۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھی بزم کے اراکین نہیں ہو سکتے۔ جو کسی مذہبی فرقہ سے اپنے آپ کو منسوب کریں یا فرقہ وارانہ ذہنیت رکھیں۔

(۲) ملک میں امن قائم رکھنے اور قانون کا احترام پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت نہایت پُرسکون طریق سے کی جائے اور اس باب میں کسی سے الجھا نہ جائے۔

(۳) کسی ایسے شخص کو بزم کا رکن نہ بنایا جائے۔ جس میں الحاد اور بےدینی کے جراثیم ہوں۔

کراچی کے دوستو! آیئے اور ہر اتوار کی صبح کو سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کی زبان میں سنئے کہ قرآن عصر حاضر کے چیلنج کا علیٰ وجہ البصیرت کیا جواب دیتا ہے اور زندگی کے درپیش مسائل کا کس قدر واضح اور نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔